اسلامی ریاست
میں فقہی مسائل

امین احسن اصلاحی

# اسلامی ریاست میں فقہی مسائل کا حل

تالیف

امین احسن اصلاحی

شائع کردہ

مکتبہ یثرب ۱۰-اے، دی مال لاہور

# فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# دیباچہ

اس کتابچہ میں تین باتیں میں نے واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔

ایک یہ کہ مسلمانوں کے اندر فقہ کے جو مختلف مذہب پائے جاتے ہیں ان میں کوئی بنیادی اور اصولی اختلاف نہیں ہے۔ یہ اختلاف یا تو تاویل اور اجتہاد کا معمولی اختلاف ہے جس کو زیادہ اہمیت دینے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ یا پھر یہ ہر مذہب کے متاخرین کے غلو اور تعصب کا نتیجہ ہے جس کو مٹانے کی ضرورت ہے نہ کہ پرورش کرنے کی۔ اختلافات کی پوری تاریخ بیان کرنے کے بعد میں نے اختلاف کے جو اصل نقطے ہیں وہ تعین کے ساتھ ناظرین کے سامنے رکھ دیئے ہیں۔ ان کو دیکھ کر ہر شخص خود فیصلہ کرے گا کہ یہ چیزیں باقی رکھنے کی ہیں یا مٹانے کی۔

دوسری یہ کہ یہ اختلافات نہ صرف یہ کہ کسی پہلو سے اسلامی نظام کے قیام میں مزاحم نہیں ہیں بلکہ یہ اسلامی نظام کے قیام کا مطالبہ کرتے ہیں کیونکہ یہ اپنی جائز حد سے بڑھے ہی اس وجہ سے ہیں کہ ایک مدت سے مسلمان اسلامی نظام کی برکتوں سے محروم ہیں۔ اگر اسلامی نظام موجود ہوتا تو یہ اختلافات صرف اسی حد تک بڑھتے جس حد تک ان کا بڑھنا امت کے لیے موجب خیر و برکت ہوتا۔ اس حد سے اگر یہ آگے بڑھنے کی کوشش کرتے تو اسلامی نظام کی مشین خود بخود ان کو کاٹ چھانٹ کر درست کر دیتی اسلامی نظام کے موجود نہ ہونے ہی کے سبب سے یہ خودرو جھاڑیوں کی طرح بڑھتے رہے ہیں۔ یہاں تک کہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ اختلافات ہی باقی رہ گئے ہیں اور اصل دین غائب ہو چکا ہے۔

تیسری یہ کہ جو فرقے مسلمانوں کے اندر شامل سمجھے جاتے ہیں ان کو اسلامی نظام سے متوحش ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ اول تو ایک صحیح اسلامی ریاست تاویل کی غلطیوں اور گمراہیوں کو برداشت کرنے میں انتہائی حد تک روادار ہوتی ہے۔ ثانیاً اگر وہ کسی گمراہی کو برداشت نہیں بھی کرتی ہے تو اس کے معنیٰ یہ نہیں ہیں کہ اس گمراہی کے مرتکبین کے لئے اس کے نظام کے اندر سرے سے کوئی جگہ ہی باقی نہیں رہی ہے۔ وہ ایسے لوگوں کو بھی حقوق دیتی ہے اور ان کی حفاظت کرتی ہے بشرطیکہ وہ ریاست کے وفادار رہیں اور کوئی ایسی بات نہ کریں جس سے ریاست کی سلامتی خطرے میں پڑے۔

اس کتابچہ کی تالیف میں زیادہ تر میں نے شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ

کی حجۃ البالغہ اور ان کے دو رسالوں الانصاف اور عقد الجید سے مدد لی ہے اور جہاں جہاں ضرورت محسوس کی ہے ان کی اصلی عبارتوں کے ترجمے دیئے ہیں تاکہ کسی شخص کو یہ بدگمانی کرنے کا موقع نہ رہے کہ میں نے اپنے خیالات کو شاہ صاحب کی طرف منسوب کر کے ان کو مزین کرنے کی کوشش کی ہے۔

یہ کتاب اگرچہ مختصر ہے لیکن مختلف اسباب سے میری نظر میں بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کے فائدہ کو عام کرے اور اگر کوئی بات میرے قلم سے اس میں حق کے خلاف نکل گئی ہو تو اس کے ضرر سے مجھ کو بھی محفوظ رکھے اور مسلمانوں کو بھی۔

امین احسن اصلاحی

لاہور

جون ۱۹۵۱ء
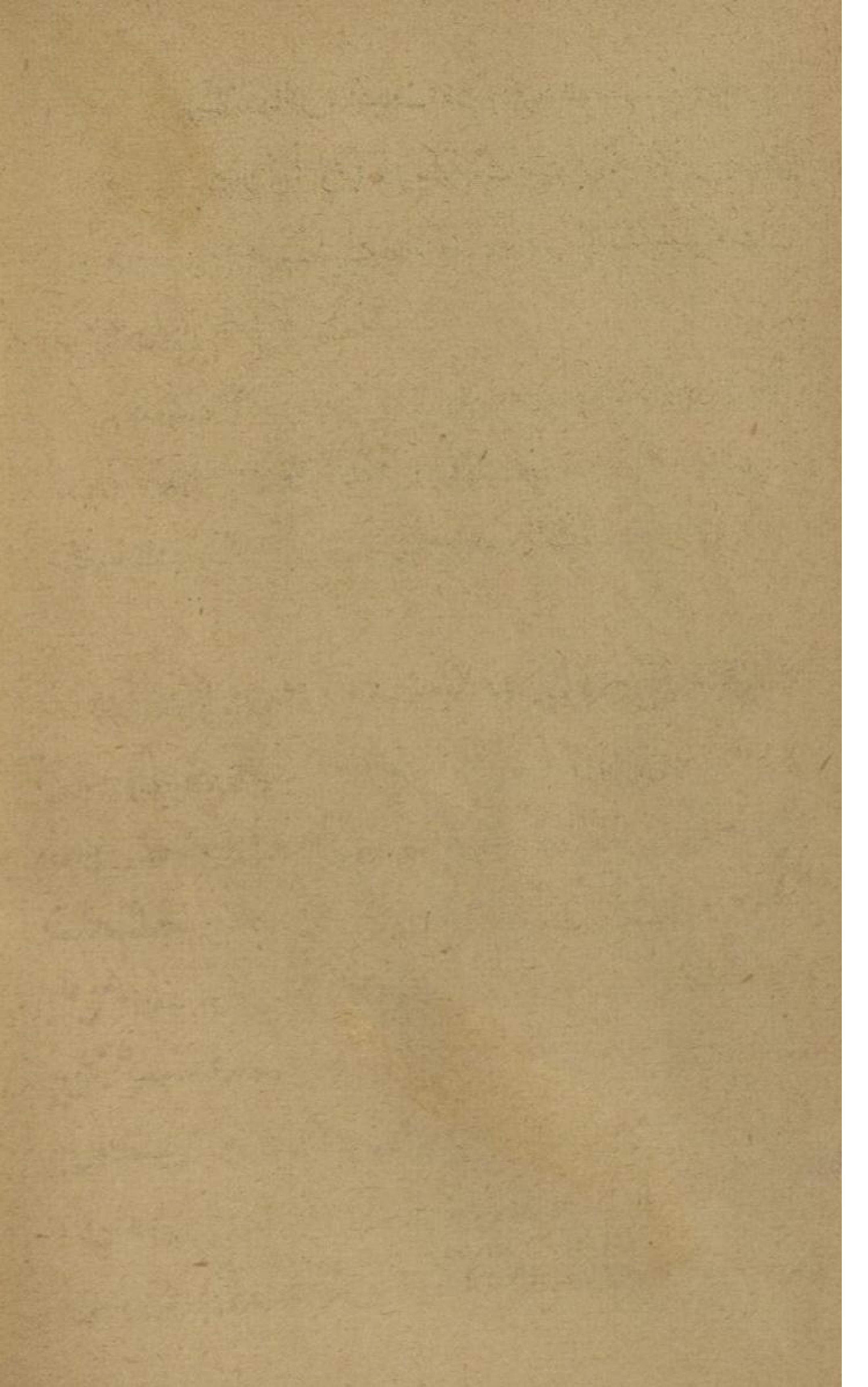
بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جو لوگ اس ملک میں اسلامی نظام کے قیام کے مخالف ہیں وہ اس کے خلاف سب سے بڑی دلیل جو پیش کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ اسلام کے اندر فقہ کے مختلف مذاہب پیدا ہو گئے ہیں اور ان میں سے ہر مذہب کے ماننے والوں نے اپنے الگ الگ گروہ بنا لئے ہیں جن کے اندر نہایت شدید قسم کے تعصبات موجود ہیں جن کی جڑیں دلوں میں اتنی گہری اتر چکی ہیں کہ اب ان کو اکھاڑنا بالکل ناممکن ہے اسی طرح یہ لوگ کہتے ہیں کہ مسلمانوں کے اندر بہت سے الگ الگ فرقے ہیں مثلاً شیعہ، قادیانی، آغا خانی، وغیرہ جو عام مسلمانوں سے فقہی مسائل میں بھی اختلاف رکھتے ہیں اور عقاید میں بھی اختلاف رکھتے ہیں اور یہ اختلافات اتنے مستحکم اور پختہ ہو چکے ہیں کہ اس کا بالکل امکان باقی نہیں رہا ہے کہ ان کو کسی ایک دینی نظام کے تحت جمع کر کے مطمئن کیا جا سکے۔ ان اسباب سے، اس گروہ کے نزدیک، اس ملک کے استحکام اور اس کی سلامتی اور اس کے

اندر بسنے والے مختلف مسلمان فرقوں کے حقوق کے تحفظ کے نقطۂ نظر سے، صحیح راستہ صرف یہ ہے کہ یہاں کوئی دینی نظام قائم کرنے کی بجائے ایک لادینی نظام قائم کیا جائے تاکہ جو گروہ یا جو فرقے یہاں اقلیت میں ہیں ان کو یہ اندیشہ نہ رہے کہ حکومت ان کے ساتھ کوئی ناانصافی کر سکے گی۔

یہ خیال اگرچہ ایک نہایت ہی محدود گروہ کا خیال ہے تو اس بات کا بالکل اندیشہ نہیں کہ اس ملک کی رائے عام کے مقابل میں یہ فروغ پا سکے گا بلکہ توقع یہی ہے کہ اس طرح کے تمام خیالات اس رجحان عام کے مقابل میں دب جائیں گے جو اسلامی نظام کے حق میں اس ملک کی اکثریت کے اندر موجود ہے لیکن مندرجہ ذیل وجوہ سے اس بات کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ علماء کے فقہی اختلافات کی نوعیت اور ایک اسلامی نظام کے تحت مسلمانوں کے مختلف فرقوں کی حیثیت تفصیل کے ساتھ واضح کر دی جائے۔

(۱) ایک وجہ یہ ہے کہ عام طور پر لوگوں کو یہ بات معلوم نہیں ہے کہ مسلمانوں کے اندر فقہی اختلافات کس طرح پیدا ہوئے؟ ہمارے دین میں ان اختلافات کے لئے کس حد تک گنجائش موجود ہے؟ شرعی نقطۂ نظر سے ان اختلافات کو کس حد تک اہمیت حاصل ہے؟ اور ایک صحیح اسلامی نظام سیاسی کے اندر یہ اختلافات کس پہلو سے باقی رہتے ہیں اور کس پہلو سے مٹ جایا کرتے ہیں؟ ان باتوں کے نہ جاننے کی وجہ سے صرف عوام ہی نہیں بلکہ ہمارے علماء تک کا حال یہ ہے کہ انھوں نے تاویل اور اجتہاد کے اختلاف کو عقیدہ اور اصول کا اختلاف بنا دیا ہے اور ہماری اسلامی فقہ کے مختلف اسکولوں میں ایک دوسرے کے خلاف

بالکل اسی طرح کے تعصبات پیدا ہو گئے ہیں جس طرح کے تعصبات دو مختلف العقیدہ فرقوں کے اندر پیدا ہو جایا کرتے ہیں۔

(۲) دوسری وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے اندر بہت سے ایسے فرقے بھی شامل ہیں جو مسلمانوں کے سوادِ اعظم سے صرف فقہی مسائل ہی میں اختلاف نہیں رکھتے ہیں بلکہ بعض عقائد میں بھی اختلاف رکھتے ہیں ــــ مثلاً شیعہ اور قادیانی وغیرہ ــــ یہ فرقے اس بات سے واقف نہیں ہیں کہ کہ ایک صحیح اسلامی نظام میں وہ اپنے عقیدہ اور عمل کی آزادی کس حد تک محفوظ رکھ سکیں گے۔ اس ناواقفیت کے سبب سے وہ بسا اوقات اسلامی نظام کے خلاف بدگمانیوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور یہ خیال کرنے لگتے ہیں کہ ایک دینی نظام کے مقابل میں ایک لادینی نظام میں وہ اپنی مذہبی آزادی کو زیادہ اچھی طرح محفوظ رکھ سکیں گے۔

(۳) تیسری وجہ یہ ہے کہ ہمارے اربابِ کار اگرچہ اپنی پبلک تقریروں میں یہی اعلان کرتے پھرتے ہیں کہ اس ملک کا دستور اور نظام اسلامی ہی ہوگا، یہاں تک کہ انھوں نے اس کے لئے قراردادِ مقاصد بھی پاس کر دی ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ اسلامی نظام کا نہ تو ان کو علم ہی ہے اور نہ دل سے وہ اس کو چاہتے ہی ہیں۔ پبلک کے عام دباؤ سے مجبور ہو کر انھوں نے قراردادِ مقاصد پاس تو ضرور کر دی ہے لیکن وہ برابر اس کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ کسی طرح اس قراردادِ مقاصد سے جان چھڑا لے جائیں اور اس سلسلہ میں جس چیز سے سب سے زیادہ وہ فائدہ اٹھانے کی وہ کوشش کر رہے ہیں وہ یہی ہمارے علماء کے فقہی اختلافات ہیں۔ اس اختلاف کی نمائش کرنے کے لئے انہوں نے پہلے ادارہ تعلیماتِ اسلامیہ قائم

کیا اور جب اس سے یہ مقصد حاصل نہ ہو سکا تو اس کی سفارشات کو بالکل نظر انداز کر کے مسلمانوں کے تمام اداروں کو صلائے عام دے دیا گیا کہ وہ اسلامی دستور کے خاکے بنا بنا کے پیش کریں اور مقصود اس سے بظاہر صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے اختلاف رائے کا وسیع پیمانہ پر مظاہرہ کرایا جائے تاکہ یہ حضرات مسلمانوں سے یہ کہہ سکیں کہ ہم تو دل سے اس بات کے خواہشمند ہیں کہ اس ملک میں اسلامی نظام قائم ہو لیکن یہ حضرات علماء تو کسی بات پر متفق ہی نہیں ہوتے۔

یہ وجوہ اس بات کا تقاضا کر رہے ہیں کہ ہم علمائے اسلام کے فقہی اختلافات کی تاریخ، ان کے تدریجی ارتقا، اور دین کے اندر ان کی نوعیت اور حیثیت کو اچھی طرح واضح کر دیں تاکہ ایک طرف ہماری فقہ کے مختلف مذاہب کے پیرووں کے اندر جو بیجا قسم کے تعصبات پیدا ہو گئے ہیں وہ دور ہو سکیں اور دوسری طرف ان حضرات پر، جو ان اختلافات کو اسلامی نظام کے خلاف دلیل بنانا چاہتے ہیں، یہ واضح ہو سکے کہ یہ اختلافات کسی پہلو سے اسلام اور اسلامی نظام کے خلاف دلیل نہیں ہیں بلکہ یہ اختلافات اسلامی اصولوں کی وسعت کی دلیل ہیں اور فی الحقیقت یہ اس امت کے لئے رحمت بن سکتے تھے بشرطیکہ یہ خود رو جھاڑیوں کی طرح بڑھنے کے لئے نہ چھوڑ دئیے گئے ہوتے بلکہ اس بات کی نگرانی کی گئی ہوتی کہ یہ اپنی جائز حدود کے اندر رہیں اس سے آگے نہ بڑھنے پائیں، لیکن یہ کام صرف ایک صحیح اسلامی حکومت ہی انجام دے سکتی تھی اور افسوس ہے کہ مسلمان اسی چیز سے ایک عرصہ دراز سے محروم ہو چکے ہیں۔

# اسلام میں اتحاد کا طریقہ اور عثمان غنیؓ کے زمانہ تک مسلمانوں کا طرزِ عمل

## اسلام میں اتحاد کی تاکید اور اس کا طریقہ

یہ اختلافات اور تعصبات جو آج مسلمانوں کے اندر پیدا ہو گئے ہیں۔ یہ اسلام کا نتیجہ نہیں ہیں بلکہ یہ اسلام سے انحراف کا نتیجہ ہیں۔ اسلام نے تو نہ صرف ان اختلافات سے بچتے رہنے کی سخت تاکید کی تھی بلکہ نہایت واضح طور پر وہ طریقہ بھی بتا دیا تھا جس طریقہ پر عمل کر کے ان اختلافات سے محفوظ رہا جا سکتا تھا اور ساتھ ہی اس طریقہ کی خلاف ورزی کے سبب سے پچھلی اُمتیں جن خرابیوں میں مبتلا ہو چکی تھیں ان کی طرف بھی اشارہ کر دیا تھا تاکہ مسلمان ان کے انجام سے عبرت حاصل کر سکیں۔ قرآن مجید کی مندرجہ ذیل آیت ملاحظہ ہو:۔

| | |
|---|---|
| وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ | اور اللہ کی رسّی کو سب مل کر مضبوطی کے ساتھ پکڑے رہو اور پراگندہ نہ ہو جاؤ، اور اپنے اوپر اللہ کے اس فضل کو یاد رکھو کہ تم آپس میں ایک دوسرے کے |

بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ وَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ

(۱۰۳-۱۰۵- آل عمران)

دشمن تھے تو اس نے تمہارے دلوں کو جوڑا اور تم اس کی رحمت سے بھائی بھائی بن گئے اور تم آگ کے کھڈ کے بالکل کنارے پر کھڑے تھے تو اللہ نے تم کو اس سے بچایا۔ اسی طرح اللہ تمہارے لئے اپنی آیتوں کو کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ تم راہ یاب ہو۔ اور تم میں سے ایک خاص گروہ ہونا چاہیئے جس کا کام یہ ہو کہ وہ لوگوں کو بھلائی کی دعوت دے، معروف کا حکم کرے اور منکر سے روکے اور وہی لوگ کامیاب ہونیوالے ہیں۔ اور ان لوگوں کی طرح نہ بن جانا جو (اللہ کی رسی چھوڑ کر) پراگندہ ہو گئے اور خدا کی طرف سے کھلی کھلی آیتیں پانے کے بعد انہوں نے آپس میں اختلاف کیا۔ اور ان کیلئے بڑا عذاب ہے۔

مذکورہ بالا آیت میں مسلمانوں کو متحد رہنے کی تاکید بھی فرمائی گئی ہے اور ساتھ ہی اس اتحاد کو برقرار رکھنے کے لئے مندرجہ ذیل ہدایات بھی دی گئی ہیں:-

(۱) پہلی ہدایت یہ ہے کہ تمام مسلمانوں کو متحد ہو کر اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑنا چاہیئے اور پراگندہ نہ ہونا چاہیئے۔ "اللہ کی رسی" سے مراد وہ عہد و میثاق ہے جو ہمارے اور ہمارے رب کے درمیان ہوا ہے ــــ یعنی قرآن مجید ــــ "قرآن مجید کو مضبوط پکڑنے" سے مراد یہ ہے کہ خدا نے ہماری

انفرادی و اجتماعی زندگی کے لئے جو ضابطہ اس کے ذریعے سے ہم کو دیا ہے ہم اسی ضابطہ پر چلیں،
اس کے خلاف کوئی ضابطہ نہ خود اپنے جی سے بنائیں نہ کسی دوسرے کے بنائے ہوئے کسی
ضابطہ کو، جو اس کے خلاف ہو، اپنی انفرادی یا اجتماعی زندگی کیلئے پسند کریں۔ ہر سوال جو ہمارے
سامنے آئے ہم سب سے پہلے اس کے حل کے لئے اسی کی طرف رجوع ہوں، ہر فکری و نظری الجھن
میں وہی ہمارے لئے مصدر الہام ہو، ہر مشکل میں وہی ہماری رہنمائی کرے، جس چیز کو وہ حق قرار
دے ہم اس کو حق قرار دیں اور جس چیز کو وہ باطل قرار دیدے ہم اس کو باطل قرار دے دیں۔ ہر حال
میں وہی ہمارا ہادی اور امام ہو اور ہم اس کی ہدایت کے خلاف کسی حالت میں بھی کسی کی رہنمائی
قبول نہ کریں۔

"پراگندہ نہ ہونے" سے مطلب یہ ہے کہ "حبل اللہ" کو چھوڑ کر ہم الگ الگ اماموں کی عصبیت
میں مبتلا نہ ہو جائیں کہ حق و ہدایت قرآن کے بجائے اشخاص و افراد کے اندر محصور ہو کر رہ جائے۔
یہاں تک کہ جو کچھ ان کی طرف منسوب کر کے روایت کر دیا جائے نہ اس کو قرآن کی کسوٹی پر پرکھنے ہی
کی ضرورت محسوس کی جائے اور نہ یہی تسلیم کیا جائے کہ حق اس کے سوا کچھ اور بھی ہو سکتا ہے

(۲) دوسری ہدایت یہ ہے کہ مسلمانوں کے اندر ایک سیاسی ادارہ (خلافت) اس مقصد
کے لئے قائم کیا جائے کہ وہ ایک طرف عام خلق الہٰی کو اس بھلائی اور خیر کی طرف بلاتا رہے جس کی
طرف قرآن نے رہنمائی کی ہے تاکہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اختلاف اور پراگندگی کے جہنم
سے نکال کر اتفاق و محبت کی شاہراہ پر کھڑا کر دیا ہے اسی طرح تمام دنیا اتفاق و محبت کی برکتوں
سے مالا مال ہو جائے۔ اور دوسری طرف وہ ادارہ مسلمانوں کو معروف پر چلتے رہنے اور منکر سے

بچتے رہنے کی ہدایت کرتا ہے تاکہ مسلمان پھر اُسی گڑھے میں نہ جا گریں جس سے قرآن مجید نے ان کو ہاتھ پکڑ کے نکالا ہے اور ان کے اندر اختلافات کی وہی آندھیاں پھر نہ چلنے لگیں جو عرب جاہلیت میں چلا کرتی تھیں۔

(۳) تیسری نصیحت یہ فرمائی ہے کہ اس واضح ہدایت کے بعد تم ان لوگوں کی طرح نہ بن جانا جو خدا کی طرف سے نہایت واضح ہدایات پانے کے باوجود الگ الگ ٹولیوں میں بٹ گئے اور ان کے اندر جھگڑے اور اختلافات اُٹھ کھڑے ہوئے۔

یہ یہود اور نصاریٰ کی طرف اشارہ ہے جو حبل اللہ کو ترک کر دینے اور الگ الگ اماموں اور مقتداؤں کی بے جا عصبیت میں گرفتار ہو جانے کی وجہ سے تفرق اور اختلاف کی ایسی آفت میں مبتلا ہو گئے کہ ہر گروہ نے اپنے اپنے علماء اور پیروں ہی کو اپنا رب بنا لیا اور کتاب اللہ سے ان کا سرے سے کوئی تعلق ہی باقی نہیں رہ گیا۔ چنانچہ قرآن مجید نے ان کی حالت کا نقشہ یہ پیش کیا ہے :-

| | |
|---|---|
| اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (۳۱ - توبہ) | اُنھوں نے اپنے عالموں اور صوفیوں کو اللہ کے سوا اپنا رب بنا لیا۔ |

اس حالت میں مبتلا ہونے کی جو سزا یہود کو ملی اس کا ذکر بھی قرآن مجید نے ان الفاظ میں فرمایا ہے :-

| | |
|---|---|
| فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ لَعَنّٰهُمْ وَجَعَلْنَا قُلُوْبَهُمْ قٰسِيَةً | پس بسبب اس کے کہ اُنھوں نے اس عہد کو توڑ دیا جو ان سے باندھا گیا تھا ہم نے ان کے اوپر لعنت کر دی |

ٹھیک یہی حال نصاریٰ کا بھی ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو جو روشنی عطا فرمائی تھی انہوں نے اسکی حفاظت نہیں کی بلکہ اس کو گل کر کے وہ سرے سے اس چیز ہی سے محروم ہو گئے جو جھگڑوں کو چکانے والی اور اختلافات کو مٹانے والی بن سکتی تھی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے اندر جو اختلاف بھی اٹھا قیامت تک کے لئے اس کے مٹنے کی کوئی صورت ہی باقی نہیں رہ گئی۔ چنانچہ قرآن مجید نے ان کی باہمی جنگ و جدل کا نقشہ ان الفاظ میں پیش کیا ہے:۔

وَمِنَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰٓى اَخَذْنَا مِيْثَاقَهُمْ فَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَاَغْرَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ؕ

اور ان لوگوں سے جنہوں نے کہا کہ ہم نصاریٰ ہیں ہم نے عہد لیا تو انھوں نے اس چیز کا ایک حصہ بھلا دیا جس کے ذریعہ سے ان کو یاد دہانی کی گئی تھی تو ہم نے ان کے درمیان قیامت تک کے لئے دشمنی اور نفرت کی آگ بھڑکا دی۔

## دین میں کتاب الٰہی کی اہمیت اور مرکزیت

قرآن مجید کی ان واضح ہدایات کا اثر یہ ہوا کہ جب تک امت کے اندر اصلی دینی روح موجود رہی اس وقت تک ان کے اندر جو مرکزیت قرآن مجید کو حاصل رہی وہ کسی دوسری چیز کو حاصل نہیں ہوئی۔ یہی کتاب ان کے تمام فکر و عمل کا مصدر تھی۔ ہر پیش آنے والے معاملہ میں وہ اسی کی طرف رہنمائی حاصل کرنے کے لئے رجوع کرتے تھے اور سب سے پہلے وہ اسی کتاب کے علم و عمل میں ماہر ہونے کی کوشش کرتے تھے۔ چنانچہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:۔

قال كان الرجل منا اذا تعلم عشر آيات لم يجاوزهن حتى يعرف معانيهن والعمل بهن

ہم میں سے جو شخص قرآن مجید کی دس آیتیں بھی سیکھ لیتا تو وہ اس وقت تک ان سے آگے نہ بڑھتا جب تک ان کے معانی سے اچھی طرح واقف نہ ہو جائے اور ان پر عمل کرنے نہ لگ جائے۔

اس کتاب کے علم کی جو قدر و عزت مسلمانوں کی نگاہوں میں تھی اس کا اندازہ انہی عبد اللہ بن مسعودؓ کے ایک دوسرے بیان سے لگایا جا سکتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:-

ولو اعلم احدا اعلم بكتاب الله تناله المطايا لاتيته

اگر مجھے پتہ چلتا کہ کوئی شخص مجھ سے زیادہ اللہ کی کتاب کا جاننے والا ہے اور سواریوں کے ذریعے اس کے پاس پہنچا جا سکتا ہے تو میں اس کے پاس ضرور پہنچتا

اور یہی کتاب تمام قضا اور فتویٰ کی بنیادی کتاب تھی۔ چنانچہ جن لوگوں کو مسلمانوں کے مقدمات کا فیصلہ کرنے کی خدمت پر مامور کیا جاتا تھا ان کو تمام پیش آنے والے معاملات میں سب سے پہلے اسی کتاب کی طرف رجوع کرنے کا حکم دیا جاتا۔ چنانچہ حضرت معاذؓ سے روایت ہے:-

عن معاذ انه قال لما بعثني رسول الله صلى الله عليه وسلم الى اليمن قال كيف تقضي اذا عرض لك قضاء قال اقضي بكتاب الله قال فان لم يكن في كتاب الله قال فبسنة

معاذ بن جبل سے روایت ہے کہ جب مجھ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یمن بھیجا تو فرمایا کہ جب تمہارے سامنے کوئی معاملہ فیصلہ کیلئے آئے گا تو تم اس کا فیصلہ کس طرح کروگے؟ میں نے جواب دیا کہ میں اس کا فیصلہ اللہ کی کتاب کی روشنی میں کروں گا۔ فرمایا اگر

رسول اللہ قال فان لم یکن فی سنة رسول اللہ قال اجتهد رایی ولا آلو قال فضرب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صدرہ وقال الحمد للہ الذی وفق رسول رسول اللہ لما یرضی بہ رسول اللہ -

اللہ کی کتاب میں اسکے متعلق کوئی واضح بات نہ ملے تو کیا کرو گے؟ میں نے عرض کیا کہ پھر رسول اللہ کی سنت کے مطابق کروں گا پھر فرمایا اگر رسول اللہ کی سنت میں بھی اسکے متعلق کوئی واضح ہدایت موجود نہ ہو تو ایسی صورت میں کیا کرو گے؟ میں نے عرض کیا تو پھر میں اجتہاد کروں گا اور اس اجتہاد میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھوں گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میری یہ بات سنی تو میرے سینہ پر ہاتھ مارا اور فرمایا کہ اس اللہ کا شکر ہے جس نے رسول اللہ کے نمائندے کو اس بات کی توفیق دی جو رسول اللہ کو پسند ہے۔

بعینہٖ اسی بات کی ہدایت حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے قاضی شریح کو فرمائی۔ انہوں نے ان کو لکھا کہ:-

اذا وجدت شیئا فی کتاب اللہ فاقض بہ ولا تلتفت الی غیرہ واذا اتی شیء لیس فی کتاب اللہ ولیس فی

جب تمہیں اللہ کی کتاب میں کوئی بات مل جائے تو اس کے مطابق فیصلہ کر دو اور اس کے سوا کسی اور چیز کی طرف توجہ مت کرو اور جب کوئی ایسا معاملہ پیش آجائے جس کے متعلق نہ اللہ کی

| | |
|---|---|
| سنۃ رسول اللہ ولم یقل فیہ احد قبلک فان شئت ان تجتھد رایک فتقدم وان شئت ان تتاخر فتاخر وما اری التاخر الا خیرا لک | کتاب میں کچھ ہو نہ رسول اللہ کی سنت میں کچھ ہو اور نہ تم سے پہلے کسی اور نے اس بارہ میں کوئی فیصلہ کیا ہو تو تم اگر اس کے بارہ میں اجتہاد کرنا چاہو تو اجتہاد کرو اور اگر توقف کرنا چاہو تو توقف کرو اور میں توقف کو تمہارے لئے بہتر ہی خیال کرتا ہوں۔ |

اس مضمون کی روایات تھوڑے بہت تغیر اور بعض باتوں کی تشریح کے ساتھ عبداللہ بن مسعودؓ عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے بھی مروی ہیں۔ ان تمام روایات سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ خیر القرون میں ہر معاملہ میں پہلی سند اور پہلا مرجع اللہ کی کتاب تھی کسی مفتی اور قاضی کے سامنے جب کوئی معاملہ لایا جاتا تو وہ اس کا جواب دینے یا اس کا فیصلہ کرنے کے لئے سب سے پہلے کتاب اللہ ہی کی طرف رجوع کرتا، جب اس میں اس کو کوئی واضح بات نہ ملتی تو پھر رسول اللہ کی سنت میں دیکھتا اور اگر اس میں بھی اس کو کوئی چیز نہ ملتی تو بدرجہ آخر اجتہاد سے کام لیتا۔

**سنت رسول اللہ**

اور یہ سنت رسول اللہؐ کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو کتاب اللہ سے بالکل الگ ہو یا اس کے خلاف ہو، یا کتاب اللہ کی مرکزیت کو نقصان پہنچانے والی ہو یا امت کی اس وحدت کو جو حبل اللہؐ کے ذریعہ سے قائم کی گئی ہے کسی پہلو سے تقسیم کرنے والی ہو۔

سنت رسول اللہ در حقیقت کتاب الٰہی کی تشریح و تفسیر ہے۔ جو باتیں قرآن مجید کے اجمالات و اشارات کے اندر چھپی ہوئی ہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہی باتوں کو واضح فرما دیا ہے۔ اس وجہ سے کتاب اللہ کے بعد سنت رسول اللہ کی طرف رجوع کرنے کی جو ہدایت کی گئی ہے تو یہ کتاب اللہ سے الگ کسی چیز کی طرف رجوع کرنے کی ہدایت نہیں کی گئی ہے بلکہ کتاب اللہ ہی کی اس توضیح و تشریح کی طرف رجوع کرنے کی ہدایت کی گئی ہے جو صحیح طریقہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ماثور و منقول ہے۔ ظاہر ہے کہ قرآن مجید کی توضیح و تشریح کرنے کا حق نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ نہ کسی کو ہو سکتا ہے اور نہ کسی دوسرے کی توضیح و تشریح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی توضیح و تشریح کے مقابل میں لائق قبول ہو سکتی ہے البتہ اس بات کی تحقیق ضروری ہے کہ اس کی نسبت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف صحیح ہو۔

ہمارے محقق علمائے نے سنت کی حقیقت یہی سمجھی ہے اور یہ بالکل صحیح ہے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے اپنے زمانہ کے منکرین حدیث و سنت کو جو جوابات دیئے ہیں اس سے اس بات کی تائید ہوتی ہے چند مثالیں ملاحظہ ہوں:-

عن عمران بن حصين انه قال لرجل انك امرؤ احمق اتجد في كتاب الله الظهر اربعا لا تجهر فيها بالقراءة ثم عدد عليه الصلوة والزكوة ونحو هذا ثم قال اتجد فيه الصلوة

عمران بن حصین سے مروی ہے کہ انہوں نے کسی شخص سے (غالباً کسی منکر حدیث سے) کہا کہ تم ایک احمق آدمی معلوم ہوتے ہو۔ بھلا قرآن مجید میں کہیں واضح الفاظ میں یہ ہے کہ ظہر کی رکعتیں چار ہیں اور ان میں قراءت جہری نہیں ہونی چاہیئے؟ پھر

والزکوٰۃ ونحو ھذا ثم قال اتجد فی کتاب اللہ مفسرا؟ ان کتاب اللہ ابہم ھذا وان السنۃ تفسر ذالک

اسی طرح انھوں نے نماز، زکوٰۃ اور اسی طرح کی دوسری چیزوں کو گنا کر سوال کیا کہ کیا ان چیزوں کی تفصیلات قرآن مجید میں موجود ہیں؟ سے قرآن نے تو ان چیزوں کو اجمالی طور پر بیان کیا ہے اور سنت نے ان کی تفصیل کر دی ہے۔

ایک اور محقق کا جواب ملاحظہ ہو:۔

عن ایوب ان رجلا قال لمطرف بن عبداللہ بن الشخیر لا تحدثونا الا بالقرآن فقال لہ مطرف واللہ ما نرید بالقرآن بدلا ولکن نرید من ھو اعلم بالقرآن منا

ایوب سے مروی ہے کہ ایک شخص نے غالبا کسی منکر حدیث وسنت نے مطرف بن عبداللہ بن شخیر سے کہا کہ ہم سے قرآن کے علاوہ کچھ نہ بیان کیا کرو۔ مطرف نے اس کو جواب دیا کہ خدا کی قسم ہم قرآن کا بدل نہیں پیش کرتے بلکہ اس شخص کی باتیں پیش کرتے ہیں جو ہم سے زیادہ قرآن کو جاننے والا تھا (یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم)

بعینہ یہی بات حدیث وسنت کے سب سے بڑے عالم حضرت امام احمد بن حنبل سے بھی مروی ہے۔ وہ بھی سنت کو کتاب الٰہی کی تفسیر وتوضیح قرار دیتے ہیں اور نہایت واضح الفاظ میں اس امر کا بھی اعلان کرتے ہیں کہ سنت کتاب اللہ کی کسی چیز کو رد نہیں کر سکتی۔ کتاب اللہ کو صرف کتاب اللہ ہی منسوخ کر سکتی ہے۔

قال الفضل بن زیاد سمعت ابا عبد اللہ
یعنی احمد بن حنبل وسئل عن
الحدیث الذی روی ان السنۃ
قاضیۃ علی الکتاب فقال ما اجسر
علی ھذا ان اقولہ ان السنۃ قاضیۃ
علی الکتاب، ان السنۃ تفسر الکتاب
وتبینہ قال الفضل وسمعت احمد
بن حنبل یقول لا تنسخ السنۃ شیئاً
من القرآن قال لا ینسخ القرآن
الا القرآن

فضل بن زیاد نے کہا کہ ابو عبد اللہ یعنی احمد بن
حنبل سے اس حدیث کی بابت سوال کیا گیا جس کا
مفہوم یہ ہے کہ سنت کتاب اللہ کے خلاف فیصلہ کر
سکتی ہے، انہوں نے جواب دیا کہ میں یہ کہنے کی جرأت
نہیں کر سکتا کہ سنت کتاب اللہ کے خلاف فیصلہ کر
سکتی ہے بلکہ سنت تو کتاب اللہ کو واضح کرنے والی
چیز ہے فضل نے بیان کیا کہ میں نے احمد بن حنبل کو
فرماتے سنا کہ سنت قرآن کی کسی بات کو منسوخ
نہیں کر سکتی۔ قرآن کو صرف قرآن ہی منسوخ
کر سکتا ہے۔

سنت کے معاملہ میں یہی مذہب حضرت امام شافعی اور جمہور اصحاب مالک کا بھی ہے۔

لیکن یہ بات یہاں یاد رکھنی چاہئے کہ چونکہ سنت قرآن کی ایسی تفسیر ہے جو ایک معصوم کی طرف
سے کی گئی ہے جس کا اجتہاد بے خطا اور جس کا استنباط بالکل قطعی اور بالکل غیر مشتبہ ہے، اس
لئے قرآن کے بعد ہم نہ صرف اس کی پیروی کو ضروری قرار دیتے ہیں بلکہ اس بات کو بھی صحیح قرار دیتے
ہیں کہ اس کی جزئیات سے اصول و کلیات مستنبط کر کے بعینہ اسی طرح ان اصول و کلیات سے مسائل
کی تخریج کی جائے جس طرح قرآن سے مستنبط کلیات کی روشنی میں مسائل کی تخریج کی جاتی ہے۔ یہ درجہ
کتاب اللہ کے سوا صرف سنت رسول اللہ کو حاصل ہے، سنت رسول اللہ کے سوا کسی امام و مجتہد

کے اجتہادات و استنباطات کو یہ درجہ حاصل نہیں ہے کہ اس کے اجتہادات ہمارے لئے اصول اور سانچہ کا کام دے سکیں اور ہم ان کو کلیات کی حیثیت دے کر ان کو مسائل کی تخریج کے لئے بنیاد بنا سکیں۔

**اجتہاد رائے** جس طرح سنت کتاب الٰہی سے کوئی الگ چیز نہیں ہے اسی طرح اجتہاد رائے بھی کتاب الٰہی اور سنت سے کوئی علیحٰدہ شے نہیں ہے۔ اجتہاد رائے سے مراد یہ ہے کہ جن پیش آنے والے معاملات کے بارہ میں قرآن یا سنت رسول اللہ میں کوئی واضح بات موجود نہ ہو ان پر قرآن و سنت کے اشارات کی رہنمائی میں غور کر کے یہ طے کرنا کہ ان میں کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ سے لگتی ہوئی بات کیا ہو سکتی ہے۔ شریعت نے اس کے لئے جو شرطیں مقرر کی ہیں۔ ان کی رو سے صرف وہی لوگ اس منصب کے اہل ہو سکتے ہیں جو دین کی نہایت پختہ سمجھ رکھتے ہوں، جن کا مذاق کتاب و سنت کے مزاج سے پوری پوری مناسبت رکھتا ہو، جو زندگی کے معاملات کے نشیب و فراز کے ساتھ ساتھ ان مقاصد و مصالح کو بھی اچھی طرح سمجھتے ہوں، جو شریعت کے احکام میں ملحوظ ہوتے ہیں اور پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ان کا عملی اور اخلاقی درجہ اتنا بلند ہو کہ ان کی نسبت یہ شبہ نہ کیا جا سکتا ہو کہ وہ اللہ کے دین کے معاملہ میں اپنی خواہشوں کو دراندازی کا موقع دیں گے یا کسی خوف اور طمع سے مغلوب ہو کر جھوٹے اجتہادات کریں گے اور جھوٹے فتوے دیں گے۔

**فتویٰ اور اجتہاد میں سلف کی احتیاط** مسلمانوں کے اندر جب تک دینی روح باقی رہی ہر کس و ناکس کی مجال نہیں تھی کہ وہ اجتہاد کرنے اور فتویٰ دینے کی جرأت کر سکے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے بارہ میں فرمایا

تھا کہ اجرأکم علی الفتیا اجرأکم علی النار (جو شخص تم میں سے فتویٰ دینے میں سب سے زیادہ دلیر ہے وہ جہنم میں جھونکا جانے کے لئے سب سے زیادہ دلیر ہے) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس تنبیہہ کے سبب سے لوگ اجتہاد کرنے اور فتویٰ دینے کے معاملہ میں اس قدر احتیاط کرنے لگے تھے کہ اس سے زیادہ احتیاط کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ حضرت براءؓ فرماتے ہیں کہ میں انصار میں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک سو بیس ایسے صحابیوں سے ملا ہوں جن کی احتیاط کا یہ عالم تھا کہ جب ان سے کوئی مسئلہ پوچھا جاتا تو ان میں سے ہر ایک کی خواہش یہ ہوتی کہ کاش اس کے بتانے کی ذمہ داری کوئی دوسرا اُٹھائے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ خلیفہ تھے اور ان کے منصب کی ذمہ داریوں میں یہ بات داخل تھی کہ وہ پیش آنے والے معاملات کے فیصلے بھی کریں اور اگر ان کے قضاۃ و عمال کسی معاملہ میں ان سے رجوع کریں تو ان کی رہنمائی بھی کریں لیکن ان کی احتیاط کا یہ حال تھا کہ ایک مرتبہ جب ان کے ایک عامل نے کسی معاملہ میں ان سے رجوع کیا تو انھوں نے اس کو جواب میں لکھا کہ واللہ ما انا بحریص علی الفتیا ما وجدت منہ بدًا (خدا کی قسم میں جب تک فتویٰ کی ذمہ داری سے بچ سکتا ہوں اس وقت تک میں فتویٰ دینے کا خواہشمند نہیں ہوں، تمھارا علم اس ذمہ داری کے لئے کافی ہے) انہی کا ارشاد ہے کہ اعلم الناس بالفتوی اسکتھم واجھلھم بھا انطقھم جو فتویٰ کی ذمہ داریوں سے جتنے ہی زیادہ واقف ہیں وہ اتنے ہی زیادہ خاموش ہیں اور جو اس چیز سے جتنے ہی زیادہ بے خبر ہیں وہ فتوے دینے میں اتنے ہی زیادہ بیباک ہیں۔ سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ فقہاء کا یہ حال تھا کہ وہ جب تک فتویٰ دینے کی ذمہ داریوں سے بچ سکتے تھے اس وقت تک فتویٰ دینے سے گریز کرتے تھے۔ صرف اسی صورت

میں اس بارگراں کو اٹھاتے جب اس کے لئے بالکل ہی مجبور ہو جاتے حضرت امام احمد بن حنبل کا
ارشاد ہے کہ جس شخص نے اپنے آپ کو فتوی کے لئے پیش کیا اس نے اپنے سر بہت بڑی ذمہ داری
لے لی مفتی کو یہ بات یاد رکھنی چاہئیے کہ وہ اللہ کے نام سے امر و نہی کا اعلان کرتا ہے اور اس
کے بارہ میں ایک دن اس سے پرسش ہونی ہے حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ تم لوگ ہم سے فتویٰ پوچھتے ہو اور
ہماری یہ خواہش ہوتی ہے کہ کاش ہم سے فتویٰ نہ پوچھا جاتا حضرت امام مالک رحمتہ اللہ علیہ کے متعلق
منقول ہے کہ ان سے جب کوئی فتوی پوچھا جاتا تو وہ اس کا جواب اس طرح ڈرتے ہوئے
دیتے گویا جنت اور دوزخ کے درمیان کھڑے ہوئے ہیں۔

سلف سے اس قسم کے اقوال کا ایک دفتر منقول ہے سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر یہ حضرات
اجتہاد کرنے اور فتوی دینے میں اس قدر احتیاط اور اس قدر پرہیزگاری سے کیوں کام لیتے تھے؟ جس
کام کو آج ہمارے دینی مدرسوں کے معمولی مدرسین اپنے بائیں ہاتھ کا کھیل سمجھتے ہیں آخر اس میں ایسا
اشکال کیا چھپا ہوا تھا کہ عمر بن عبد العزیز اور امام مالک رحمتہ اللہ علیہ جیسے جیسے لوگ اس سے ڈرتے
تھے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ وہ اس بات کو اچھی طرح جانتے تھے کہ جس معاملہ کے متعلق اللہ کی کتاب
اور اس کے رسول کی سنت میں کوئی واضح ہدایت موجود نہ ہو اس کے متعلق زبان سے کوئی بات نکالنا
بڑی ذمہ داری کا کام ہے۔ اس طرح کے معاملات میں کتاب و سنت کے اشارات سے رہنمائی حاصل
کر کے یہ متعین کرنا کہ اللہ اور اس کے رسول کی شریعت کے مزاج سے قریب تر بات فلاں ہے، کوئی
آسان کام وہ نہیں خیال کرتے تھے۔ وہ اس راز سے بے خبر نہیں تھے کہ اس امت کی ہستی اللہ کی
کتاب سے وابستگی پر قائم ہے اور ایک مجتہد اور ایک مفتی اپنی غفلت یا اپنی کم علمی کے سبب سے

اس وابستگی کو نقصان پہنچا سکتا ہے جس کا وبال امت پر بھی آسکتا ہے اور جس سے خود اس کی آخرت بھی برباد ہو سکتی ہے۔ وہ اس حقیقت سے بھی ناواقف نہیں تھے کہ ایک مجتہد اور مفتی خدا اور اس کے بندوں کے درمیان دخیل بنتا ہے اور اللہ کے نام پر ایک چیز کو حرام یا حلال قرار دیتا ہے اس وجہ سے اس معاملہ میں اس کی غلطی کوئی معمولی غلطی نہیں ہے، بلکہ بعض حالات میں اس کی غلطی توحید اور شرک کا سوال پیدا کر دیتی ہے۔ اگر آج کے مفتیوں کی طرح ان کے سامنے بھی الگ الگ اماموں کی مرتب فقہیں ہوتیں اور ان کا کام صرف یہ ہوتا کہ ان کے اقوال یاد کر چھوڑیں اور بغیر اس امر کی تحقیق کئے کہ ان اقوال کی کتاب و سنت میں کوئی سند ہے بھی یا نہیں اور اگر ہے تو وہ کیا ہے اور اس کی حیثیت کیا ہے ان کو نقل کرتے پھریں تب تو معاملہ بے شک آسان تھا لیکن معلوم ہے کہ وہ دین کے معاملہ میں نہ تو اس سہل انگاری ہی میں مبتلا ہوئے تھے اور نہ الگ الگ اماموں کی عصبیت ہی میں گرفتار ہوئے تھے بلکہ ان کے نزدیک سب سے مقدم مسئلہ، ہر معاملہ میں، اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت سے وابستگی کا مسئلہ تھا اس وجہ سے وہ اجتہاد کی مشکلات اور اس کی ذمہ داریوں سے گھبراتے تھے۔

## صدر اول میں اجتہاد اور فتویٰ کا طریقہ

اس احتیاط و تقویٰ کی وجہ سے اسلام کے ابتدائی دور میں پیشہ ور فتویٰ نویسوں کا وجود نہ تھا، صرف وہی لوگ مجبورانہ اجتہاد و فتویٰ کی ذمہ داریوں کو ادا کرتے تھے جن پر حکومت کی طرف سے، ان کی اہلیت کے سبب سے، یہ ذمہ داری ڈال دی جاتی تھی۔ فتویٰ اور قضا تو در کنار، اس زمانہ میں وعظ و نصیحت کرنے کے لئے بھی ہر شخص پیش قدمی کرنے کی جرأت نہیں کرتا تھا۔ اس فرض کو بھی بیشتر وہی لوگ انجام دیتے تھے جو حکومت کی طرف سے اس خدمت پر مقرر کئے

جاتے تھے۔ اسکے متعلق ابوداؤد میں ایک روایت بھی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں کو وعظ کرنا امیر کا کام ہے یا اس کے مقرر کئے ہوئے نمائندے کا۔ جو لوگ محض اپنی طلاقت لسانی کی نمائش کرنے اور اپنی چرب زبانی کی لوگوں پر دھاک بٹھانے کے لئے وعظ کرتے پھرتے ہیں درانحالیکہ وہ اس ذمہ داری سے سبکدوش ہیں ان کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت سخت ناپسند فرمایا ہے۔

| | |
|---|---|
| عن عوف بن مالک الاشجعی قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول لا یقص الا امیر او مامور او مختال | عوف بن مالک اشجعی سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا کہ وعظ نہ کہے مگر امیر یا وہ شخص جو امیر کی طرف سے مامور ہو۔ اور یا پھر وہ جو اپنی نمائش کا شوق رکھتا ہے۔ |
| (ابوداؤد باب فی القصص) | |

یہی وجہ ہے کہ صدر اول میں یہ اجتہادات لوگوں کے درمیان تفریق اور اختلاف پیدا کرنے کا باعث نہیں بنتے تھے۔ اس زمانہ میں اول تو لوگ انفرادی طور پر اپنی رایوں کے اظہار ہی میں احتیاط برتتے تھے ثانیاً اگر اظہار کرتے بھی تھے تو اس کی حیثیت ایک رائے سے زیادہ نہیں ہوتی تھی۔ ایک مجتہد اپنی انفرادی زندگی کی حد تک اپنے اجتہاد کا پابند تو ہوتا تھا لیکن نہ وہ دوسروں کو اپنے اجتہاد کا پابند بنانے کی کوشش کرتا تھا اور نہ اپنے اجتہاد کے مقابل میں دوسروں کے اجتہاد کو غلط قرار دینے کی جرأت کرتا تھا۔ جو لوگ کسی خاص مجتہد کے اجتہادات کی پیروی کرتے تھے وہ بھی دوسرے مجتہدین کے اجتہادات پر چلنے والوں کو غلطی پر نہیں

سمجھتے تھے۔ اس طرح کے انفرادی اجتہادات اگرچہ صحابہ ہی کے ہوں غلطی اور صحت دونوں کے محل سمجھے جاتے تھے اس وجہ سے کسی کو بھی یہ دعویٰ کرنے کا حق نہیں تھا کہ وہی حق پر ہے اور دوسرے باطل پر ہیں صحابہ رضی اللہ عنہم جس معاملہ میں مختلف الرائے ہو جاتے اس کے ہر پہلو میں غلطی اور صحت دونوں ہی کا امکان تسلیم کیا جاتا۔

عہد اول میں اجتہاد رائے کا اصلی طریقہ یہ تھا کہ جب لوگوں کے سامنے کوئی معاملہ آتا تو اس کو امیر یا اس کے کسی مامور کے سامنے پیش کرتے اور وہ کتاب وسنت کی روشنی میں اس کا فیصلہ کر دیتے اور اگر معاملہ پیچیدہ ہوتا تو امیر اس کے لئے ارباب اجتہاد تفقہ کی مجلس شوریٰ بلاتا اور اس معاملہ کو ان کے سامنے رکھتا اور پھر اجتماعی طور پر جو رائے طے پاتی اس کا اعلان کر دیا جاتا۔ یہی چیز ہے جس کو اجماع کہتے ہیں اور جس کو دین میں حجت ہونے کی حیثیت حاصل ہے کیونکہ اس طرح کے تمام فیصلے خلفائے راشدین نے خیر القرون کے ارباب علم واجتہاد کے مشورے سے کئے ہیں۔

اخرج الدارمی ۔ عن المسیب بن رافع قال کانوا اذا نزلت فیھم قصۃ لیس فیھا عن رسول اللہ اثر اجتمعوا لھا واجمعوا فالحق فیما رأوا۔

دارمی نے مسیب بن رافع سے روایت کی ہے کہ صحابہؓ کے سامنے جب کوئی ایسا معاملہ آتا جس کے بارہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی حدیث منقول نہ ہوتی تو وہ اس پر غور کرنے کے لئے اکٹھے ہوتے اور اس کے بارہ میں کوئی فیصلہ کرتے تو جو کچھ وہ طے کر دیتے اسی کو حق سمجھا جاتا۔

اس طرح کے اجماعی فیصلوں کی حیثیت انفرادی اجتہادات سے بالکل مختلف تھی۔ ان کو ایک مستقل شرعی حجت کا درجہ حاصل تھا۔ قاضی اور مفتی ضرورت کے وقت ان کی طرف رجوع کرتے تھے اور ان کے مطابق فتوی دیتے اور فیصلے کرتے تھے۔ حضرت عمرؓ نے قاضی شریح کو جو یہ لکھا تھا کہ ولم یقل فیہ احد (اور اس کے بارے میں کسی پیشرو کا قول بھی نہ ہو) تو اس سے بھی کسی شخص کا انفرادی قول مراد نہیں ہے بلکہ ارباب حل وعقد کا اجماعی فیصلہ ہی مراد ہے حضرت ابن عباسؓ کے متعلق روایت ہے کہ جن معاملہ میں سنت رسول اللہ سے ان کو کوئی رہنمائی نہ ملتی اس میں وہ حضرت ابو بکر اور حضرت عمر (رضی اللہ عنہما) کے اقوال اگر پاجاتے تو ان کے مطابق فیصلے کر دیتے۔ ہمارے نزدیک اس کی وجہ یہ ہے کہ ان دونوں بزرگوں کے فیصلے بالعموم مجلس شوریٰ کے مشورے سے ہوتے تھے اور ان کی حیثیت اجماعی فیصلوں کی ہوتی تھی۔

حضرت علیؓ سے ایک روایت ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر کسی معاملہ میں میری سنت کے اندر کوئی ہدایت نہ ملے تو واجعلوہ شوریٰ بینکم ولا تقضوا فیہ برأی واحد اس کو شوریٰ کے ذریعے طے کرو۔ انفرادی رائے سے اس کا فیصلہ نہ کرو۔[1]

## عثمان غنیؓ کے زمانہ تک مسلمانوں کا طرز عمل

اس تفصیل سے یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو گئی کہ خلفائے راشدین کے زمانہ میں

---

[1] بعض لوگوں نے اس روایت پر شبہ کیا ہے۔ ممکن ہے لفظاً یہ روایت صحیح نہ ہو لیکن خلفائے راشدین کا عمل اس روایت کے مفہوم کی تصدیق کرتا ہے۔

رائے اور اجتہاد کی آزادی کے باوجود مسلمانوں کے اندر نہ تو کوئی ذہنی انتشار ہی پیدا ہوا تھا اور نہ ان کی سیاسی جمعیت ہی میں کوئی فرق آیا تھا۔ وہ اپنی انفرادی و اجتماعی زندگی کے ہر گوشہ میں سب سے پہلے کتاب اللہ سے رہنمائی حاصل کرتے تھے۔ اگر کتاب اللہ میں کوئی واضح رہنمائی نہ ملتی تو سنت رسول اللہ کی طرف رجوع کرتے۔ اگر سنت رسول اللہ میں بھی کوئی واضح ہدایت نہ ملتی تو پھر اپنے ارباب حل وعقد (اولوالامر) کے سامنے معاملہ کو پیش کرتے اور یہ ان کا کام ہوتا کہ وہ اہل علم اور اہل تقویٰ سے مشورہ کر کے یہ طے کریں کہ اس معاملہ میں اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت کے مزاج سے موافق تر بات کیا ہو سکتی ہے اور پھر جو کچھ وہ طے کر دیتے سب اسی کی پیروی کرتے۔ بات طے ہونے سے پہلے تک ہر شخص کو اس امر کی آزادی حاصل ہوتی کہ وہ اپنی رائے کا پوری بے خوفی کے ساتھ اظہار کرے لیکن جب ایک بات اجماعی طور پر طے ہو جاتی تو اجتماعی زندگی میں سب اسی پر کاربند ہوتے۔ اجتماعی و سیاسی زندگی کے لئے یہی ضابطہ قرآن مجید نے مسلمانوں کو سورہ نساء کی مندرجہ ذیل آیت میں بتایا تھا۔

| | |
|---|---|
| يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ۔ | اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور اپنے اولوالامر کی اطاعت کرو اور اگر کسی معاملہ میں اختلاف واقع ہو تو اس کے لئے اللہ اور رسول کی طرف رجوع کرو۔ |

اس آیت میں اللہ، رسول اور اولوالامر کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے اور ساتھ ہی اس بات کی ہدایت کی گئی ہے کہ اگر کسی معاملہ میں اختلاف رائے واقع ہو جائے تو اس کے فیصلہ کے لئے اللہ

کی کتاب، اور اس کے رسول کی سنت، کی طرف رجوع کیا جائے۔ یہ اختلاف، ظاہر ہے کہ دو ہی صورتوں میں واقع ہو سکتا ہے۔ یا تو یہ ہوگا کہ اس امر کے بارہ میں کتاب اللہ اور سنت رسول میں کوئی ہدایت سرے سے موجود ہی نہیں ہوگی، یا ہدایت تو موجود ہو گی لیکن اس میں تاویل کے مختلف پہلو ہو سکتے ہوں گے۔ ان دونوں صورتوں میں قرآن مجید کی ہدایت یہ ہے کہ کتاب اللہ اور سنت رسول کی طرف رجوع کیا جائے۔ یعنی اگر اختلاف تاویل کی نوعیت کا ہے تو وہ تاویل اختیار کی جائے جس کی تائید کتاب و سنت کے دوسرے نظائر سے ہوتی ہو اور اگر معاملہ کا تعلق اجتہاد سے ہو تو اجتہاد میں یہ بات دیکھی جائے کہ زیر بحث معاملہ میں خدا کی شریعت کے مزاج سے قریب تربات کیا ہو سکتی ہے اور جو بات قریب تر نظر آئے وہ اختیار کر لی جائے۔

اس آیت کے ایک خاص پہلو کو نگاہ میں رکھنا چاہئے۔ وہ یہ کہ اس میں اطاعت کا حکم تو تین کے لئے دیا گیا ہے ۔۔۔ اللہ، رسول اور اولوالامر ۔۔۔ اس لئے کہ سیاسی نظام اس وقت تک وجود میں آ ہی نہیں سکتا جب تک اللہ و رسول کے ساتھ ساتھ ان لوگوں کی بھی اطاعت نہ کی جائے جو خدا اور رسول کی شریعت کے نافذ کرنے والے ہوں لیکن اختلاف واقع ہونے کی صورت میں رجوع کرنے کا حکم صرف اللہ اور رسول ہی کی طرف دیا گیا ہے، اولوالامر کو اس سے الگ کر دیا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قانون کا ماخذ صرف اللہ اور رسول ہی ہیں۔ اولوالامر قانون کا ماخذ ہیں اور نہ ان کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ کوئی قدم خدا اور اس کے رسول سے بے نیاز ہو کر اٹھائیں۔ بلکہ اختلاف پیدا ہونے کی صورت میں اللہ و رسول کی طرف رجوع کرنے کا جو حکم مذکورہ بالا آیت میں دیا گیا ہے وہ حکم دراصل اولوالامر ہی کو دیا گیا ہے کیونکہ نظام سیاسی کے ذمہ دار

ہونے کی حیثیت سے یہ انہی کی ذمہ داری ہے کہ وہ عوام کو خدا اور رسول کے راستہ پر چلائیں اور اگر کوئی ایسا موڑ آجائے جہاں اس امر کے تعین میں اختلاف ہو سکتا ہو کہ خدا کی راہ کون ہے تو وہاں خدا کی شریعت کے اشارات سے فائدہ اٹھا کر صحیح سمت کا تعین کریں۔

یہ جو کچھ ہم نے لکھا ہے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے زمانہ تک مسلمانوں کا طرز عمل یہی رہا ہے چنانچہ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ ازالۃ الخفا میں لکھتے ہیں :-

وعظ و فتویٰ موقوف بود بر رائے خلیفہ۔ بدون امر خلیفہ وعظ نمی گفتند و فتویٰ نمی دادند۔ و آخر بغیر توقف بر رائے خلیفہ وعظ می گفتند و فتویٰ می دادند و درین وقت مشاورت جماعت در فتویٰ موقوف ماند۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ و تحقیق آنست کہ تا زمان حضرت عثمانؓ اختلاف مسائل فقیہہ واقع نمی شد۔ در محل اختلاف بخلیفہ رجوع می کردند و خلیفہ بعد مشاورت امرے اختیار کردہ ہماں امر مجمع علیہ می شد۔ و بعد وجود فتنہ ہر عالمے برائے خود فتوی می داد و درین زمانہ اختلاف واقع شد۔ آنچہ شہرستانی در کتاب ملل و نحل گفتہ کہ بمجرد وفات آنحضرت

اس زمانہ تک وعظ اور فتویٰ خلیفہ کی رائے پر موقوف تھا۔ خلیفہ کے حکم کے بغیر نہ وعظ کہتے تھے اور نہ فتویٰ دیتے تھے۔ بعد میں خلیفہ کے حکم کے بغیر وعظ کہنے اور فتویٰ دینے لگے اور فتویٰ کے معاملہ میں جماعت کے مشورہ کی جو صورت پہلے تھی وہ باقی نہ رہی۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ تحقیق یہ ہے کہ حضرت عثمانؓ کے زمانہ تک فقہی اختلافات برپا نہیں ہونے پائے تھے۔ جب کوئی اختلافی صورت نمودار ہوتی خلیفہ کے سامنے معاملہ پیش کرتے، خلیفہ اہل علم و تقویٰ سے مشورہ کرنے کے بعد ایک رائے قائم کرتا اور وہی سب لوگوں کی اجماعی رائے بن جاتی حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد ہر عالم بطور خود فتوے دینے

صلی اللہ علیہ وسلم اختلاف پدید آمد خطا ست۔
اختلاف آں نیست کہ در اثنائے مشاورت
اقوال متغائرہ گوئند و بالآخر امرے منقح
شود و بر ہماں امر اجماع کنند۔ اختلاف آنست
کہ ہر دو قول مستقر پیدا شود و ہر یکے بجانب
خود بدہم وضع مخالف خواہد ... ... ... ..
و مفسدۂ عظیم کہ برآں مترتب گشت آنست
کہ طبقات متاخرین ایں تغیر را ببیتہا وصفاتہا
سنت خیال کردند ازیں جہت کہ اصل او ماخوذ
از سنت بود و لائمہ قائم نمودند بر تارک آں و
مقصر دراں۔

لگا اور اس طرح مسلمانوں میں اختلاف برپا ہوا۔ اور
شہرستانی نے اپنی کتاب ملل و نحل میں یہ جو لکھا
ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے ساتھ
فقہی اختلافات اٹھ کھڑے ہوئے تو یہ بات
صحیح نہیں ہے۔ اختلاف اس چیز کو نہیں کہتے
کہ مشورہ کے دوران میں لوگ مختلف رایوں کا
اظہار کریں یہاں تک کہ ایک منقح بات بالآخر طے
ہو جائے اور لوگ اس پر اجماع کر لیں اختلاف
یہ ہے کہ کسی امر میں دو مستقل قول پیدا ہو جائیں
اور ہر قول اپنی اپنی جگہ پر اس امر کا مطالبہ کرے
کہ وہی باقی رہے اور دوسرا مٹ جائے ......
سب سے بڑی خرابی جو اس صورت حال سے نمودار ہوئی
وہ یہ ہے کہ بعد کے لوگوں نے ان اختلافات کو،
محض اس خیال کی بنا پر کہ اگلوں نے جو کچھ کہا ہوگا
سنت نبوی ہی سے اخذ کر کے کہا ہوگا، سنت کا درجہ
دے دیا اور جن کو ان کا تارک پایا یا جن کو ان کے معاملہ میں
کوتاہی کرتے ہوئے دیکھا ان پر ترک سنت کا الزام دھرنے لگے۔

شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اس بیان سے یہ بات صاف واضح ہوتی ہے کہ جب تک اسلامی نظام اپنی اصلی صورت میں قائم رہا اس وقت تک اُمت میں اگرچہ ہر قسم کے فقہی اختلافات پیدا ہوتے تھے، اہل علم ان اختلافات پر پوری آزادی کے ساتھ بحثیں بھی کرتے تھے، لیکن یہ اختلافات مسلمانوں کے اندر انتشار اور تفریق پیدا کرنے کا سبب نہیں بنتے تھے کیونکہ ہر اختلاف بالآخر خلیفہ کے سامنے پیش ہوتا اور وہ اس کے بارہ میں اپنی مجلس شوریٰ سے مشورہ کر کے کوئی منقح بات طے کر دیتا جس کو سب تسلیم کر لیتے۔ اور اگر اس طرح کے فیصلہ سے کسی خاص شخص کو اختلاف بھی ہوتا تو اس اختلاف کی حیثیت صرف ایک رائے کی ہوتی۔ قضا و فتویٰ کے سارے معاملات خلیفہ اور مجلس شوریٰ کے فیصلہ کے مطابق ہی انجام پاتے۔

## اختلافات کا آغاز کس طرح ہوا؟

حضرت عثمان غنی رضؓ کی شہادت کے بعد فقہی اختلافات کے پیدا ہونے کے دو بڑے سبب ہوئے۔ ایک یہ کہ اس حادثہ کے بعد خلافت راشدہ کی اصلی برکت فی الحقیقت ختم ہو گئی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ ایک خلیفہ راشد ضرور تھے لیکن ان کا پورا زمانہ سخت انتشار میں گذرا۔ خلافت کی وہ شان باقی نہیں رہی کہ پیدا ہونے والے مسائل کو لوگ مرکز کے سامنے پیش کر کے اس کا حل معلوم کر سکیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بعد یہ رہی سہی حالت بھی باقی نہیں رہی۔ ان کی شہادت کے بعد ایک ایسا اقتدار مسلمانوں پر مسلط ہو گیا جس نے اپنی سیاسی طاقت کے ذریعہ سے عوام کو مرعوب تو ضرور کر لیا لیکن شرعی معاملات میں مسلمانوں کو اس کی رہنمائی پر کبھی اعتماد

نہیں ہوا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اب جو فقہی اختلافات پیدا ہوتے ان میں تالیف پیدا کرنے کی کوئی صورت سرے سے باقی ہی نہیں رہ گئی۔ لوگوں کے اندر اپنی اپنی رایوں پر یا اپنے دیار کے علما پر اعتماد کرنے کا رجحان ترقی کرنے لگا اور اختلاف کو اتحاد سے بدلنے کی مشینری باقی نہ رہنے کے سبب سے لوگوں کے اندر اسکی خواہش بھی کمزور پڑنی شروع ہو گئی۔

دوسرا سبب یہ ہوا کہ اسلامی حکومت کی وسعت کے بعد لازمی طور پر مملکت کے مختلف مرکزوں میں فتوی اور قضا کی ذمہ داریاں مختلف اشخاص نے سنبھالیں جو، اصول میں متفق ہونے کے باوجود، اپنے ذوق، اپنی معلومات اور اپنے طرز اجتہاد میں لازماً کچھ نہ کچھ مختلف تھے۔ ہر چند یہ اختلاف ایک سطحی اختلاف ہے اور دین میں اسکی کوئی اہمیت نہیں ہے لیکن ہر دیار کے عوام کو چونکہ اپنی دیار ہی کے علما پر زیادہ اعتماد ہوتا ہے اس وجہ سے یہ بات کچھ فطری سی ہے کہ اپنے دیار کی فقہ سے جو لگاؤ ہو وہ دوسرے دیار کی فقہ سے نہ ہو۔ یہی چیز ایک حد معتدل سے جب بڑھ گئی اس نے تعصب اور تحزب کی شکل اختیار کر لی اور ایک فتنہ بن گئی۔

اس اختلاف کی تاریخ کا ذہن میں ایک تصور پیدا کرنے کے لئے ہم یہاں مناسب خیال کرتے ہیں کہ اجمالاً یہ بتائیں کہ صحابہ کے بعد تابعین کے دور میں اسلامی مملکت کے مختلف شہروں میں فتوی اور قضا کی ذمہ داریاں کن لوگوں نے سنبھالیں اور ان کے فقہی اجتہادات سے لوگوں کے اندر کس طرح کے رجحانات ابھرے۔

## تابعین کا دور

صحابہ رضی اللہ عنہم کے بعد بلاد اسلام کے مختلف مرکزوں میں جن لوگوں نے فتوی اور قضا کی مسندیں سنبھالیں وہ یہ ہیں:-

مدینہ میں ـــــ سعید بن مسیب۔ سالم بن عبد اللہ بن عمرؓ۔ پھر امام زہریؒ۔ قاضی یحییٰ بن سعید۔ ربیعہ بن عبد الرحمان۔

مکہ میں ـــــ عطا بن رباح۔

کوفہ میں ـــــ ابراہیم نخعیؒ۔ شعبیؒ۔

بصرہ میں ـــــ حسن بصریؒ۔

یمن میں ـــــ طاؤس بن کیسان۔

شام میں ـــــ مکحول۔

یہی لوگ تھے جن سے قضاء و افتاء کے تمام معاملات متعلق ہوئے۔ انہی کے واسطے سے لوگوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا علم و عمل اور صحابہ کے اقوال و آثار پھیلے اور جو نئی ضرورتیں مسلمانوں کو پیش آئیں ان میں انہی کے اجتہاد و تفقہ نے ان کی رہنمائی کی۔

اس دور کے لوگوں میں سے دو آدمی نہایت نمایاں ہوئے۔ ایک سعید بن مسیب جو مدینہ کے لوگوں میں سے تھے۔ دوسرے ابراہیم نخعی جو اصحاب کوفہ میں سے تھے۔ ان لوگوں نے اپنے رفقا کے ساتھ مل کر تمام ابواب فقہ سے متعلق مسائل جمع کئے اور ہر باب میں سلف کے اصول و ضوابط معلوم کئے۔

سعید بن مسیب اور ان کے اصحاب کا خیال یہ تھا کہ فقہ میں مکہ و مدینہ کے لوگوں کا تبحر دوسروں کے مقابلہ میں اونچا ہے۔ چنانچہ انھوں نے اپنے مذہب کی بنیاد حضرت عمرؓ، حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہما اور قضاۃ مدینہ کے فیصلوں اور عبد اللہ بن عمرؓ، حضرت عائشہ صدیقہ، ابن عباس اور حضرت

ابن عباس رضی اللہ عنہم کے فتووں پر قائم کی۔ انھوں نے ان صحابہ سے جو کچھ پایا اسکو اچھی طرح محفوظ کیا اور اس میں پوری تحقیق و تفتیش سے کام لیا۔ جن مسائل میں انھوں نے اہل مدینہ کو متفق پایا ان کو تو بے دھڑک لے لیا جن مسائل میں اختلاف دیکھا ان میں ترجیح کے اصولوں کو سامنے رکھ کر کسی ایک بات کو ترجیح دی۔ اور جس امر کے بارہ میں ان کو سلف سے کوئی چیز سرے سے ملی ہی نہیں اس میں اجتہاد رائے سے کام لے کر مسئلہ کا جواب نکالا اور اس طرح ہر باب میں ان کے منقولات و اجتہادات کا ایک پورا ذخیرہ جمع ہو گیا۔

ٹھیک اسکے مقابل میں فقہ کا ایک دوسرا اسکول (مذہب) کوفہ میں کام کر رہا تھا جس کے سرگروہ حضرت ابراہیم نخعیؒ تھے۔ ابراہیم نخعیؒ اور ان کے رفقاء کا خیال یہ تھا کہ عبد اللہ بن مسعودؓ اور ان کے اصحاب فقہ میں زیادہ مضبوط اور زیادہ لائق اعتماد ہیں چنانچہ مشہور ہے کہ علقمہؒ نے مسروقؒ سے یہ کہا کہ میں اہل مدینہ میں سے کسی کو فقہ میں عبد اللہ بن مسعودؓ سے زیادہ بھروسہ کے قابل نہیں پاتا اور امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق یہ مشہور ہے کہ انہوں نے امام اوزاعی سے یہ فرمایا کہ ابراہیم سالم سے بڑے فقیہہ ہیں اور اگر شرف صحابیت کا سوال نہ ہوتا تو میں یہ کہتا کہ علقمہ عبد اللہ بن عمرؓ سے بڑے فقیہ ہیں۔

ابراہیم نخعیؒ نے اپنے مذہب کی بنیاد حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کے فتووں اور حضرت علیؓ، قاضی شریح، اور دوسرے قضاۃ کوفہ کے فیصلوں پر قائم کی۔ اور انھوں نے بھی اس تمام مواد اور ذخیرہ کو اسی طرح جانچا پرکھا جس طرح اہل مدینہ نے اپنے مواد کو جانچا پرکھا۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ تابعین کے دور ہی میں ہماری فقہ کے دو مستقل اسکول قائم ہو گئے

تھے۔ ایک کوفہ کے علماء و فقہا کا کوفہ ہیں۔ دوسرا مدینہ کے اصحاب فقہ و اجتہاد کا مدینہ ہیں۔
اور ان دونوں اسکولوں میں کوئی بنیادی اور اصولی اختلاف نہیں تھا بلکہ صرف یہ فرق تھا کہ
مدینہ کے لوگوں نے اپنے دیار کے علما و فقہا کو ترجیح دی اور کوفہ کے لوگوں نے اپنے دیار کے
علما و فقہا کو ترجیح دی۔ ایک خاص حد تک اپنے دیار کے لوگوں کو ترجیح دینے کا یہ میلان انسانی
فطرت کا مقتضی ہے۔ اور اس حد تک، جیسا کہ شاہ صاحبؒ نے فرمایا ہے، اس پر ملامت
نہیں کی جا سکتی اور اگر کوئی صحیح مرکزی قوت ان میلانات میں اعتدال اور توازن قائم کرنے
والی موجود ہو تو اس کا اندیشہ بھی نہیں ہے کہ اس کے سبب سے کوئی بنیادی خرابی واقع ہو۔
لیکن جب یہی چیز حد اعتدال سے بڑھ جائے اور کوئی مرکزی فیصلہ کن طاقت ایسی باقی نہ رہے
جو ان میلانات کو حد جائز کے اندر رکھ سکے تو اس سے وہ تمام فتنے پیدا ہو سکتے ہیں جو بالآخر
پیدا ہوئے۔

**فقہا کا دور**

تابعین کرام کے بعد فقہا کا دور آیا۔ اس دور کے لوگوں نے تابعین سے اسی
طرح دین حاصل کیا جس طرح تابعین کرام نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے حاصل
کیا تھا اور اسی اہتمام و شوق کے ساتھ اسکو اپنی تنقید و تحقیق، روایت و درایت، اور اجتہاد
و نقہ سے رونق دی جس طرح ان کے اگلوں نے اس کو رونق دی تھی۔ جہاں تک اجتہاد
کے طریقہ کا تعلق ہے یہ دور بہت بڑی حد تک سابق دور سے ملتا جلتا ہوا ہے۔ صرف چند
باتیں ایسی ہیں جو اس دور سے متعلق نوٹ کرنے کی ہیں۔
ایک یہ کہ اس دور میں مسند و مرسل ہر طرح کی حدیثیں بھی بے تکلف بننے لگے اور صحا

و تابعین کے اقوال سے بھی استناد کرنے لگے۔ اس کی وجہ یا تو یہ خیال تھا کہ تمام موقوف و مرسل حدیثیں درحقیقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے منقول ہیں، صرف اختصار کے خیال سے ان کو موقوف کر دیا گیا ہے۔ یا یہ خیال تھا کہ خود صحابہ نے کسی نص سے استنباط اور قرآن و حدیث سے اجتہاد کیا ہے اور چونکہ بعد والوں کے مقابل میں ان کا اجتہاد و تفقہ بہر حال بڑھ کر ہے اس لئے وہ لائق قبول ہے۔ اس بات کی حمایت میں بعض لوگوں نے یہ نکتہ بھی بیان کیا ہے کہ بجائے اسکے کہ ایک بات کو رسول اللہ سے نسبت دے کر اسکے جھوٹ یا سچ ہونے یا اس میں کسی کمی بیشی کی ذمہ داری اٹھائی جائے یہ زیادہ سہل ہے کہ وہ رسول اللہ صلعم سے کسی نیچے درجہ کے شخص پر ہی ختم ہو جائے۔

دوسری یہ کہ اگر کسی چیز کے بارہ میں رسول اللہ صلعم کی حدیثیں مختلف ہوتی تھیں تو صحابہؓ کے اقوال کا جائزہ لیتے تھے۔ اگر ان سے حدیث کے منسوخ ہونے یا اسکی تاویل کا کوئی پہلو واضح ہو جاتا تھا تو نبہا ورنہ یہ بات کہ صحابہؓ کسی حدیث کے ترک پر متفق ہیں اسکے ترک کے لئے کافی سمجھ لی جاتی تھی۔

تیسری یہ کہ تابعین کے دور کی طرح اس دور کے اہل علم بھی اگر کسی باب میں صحابہؓ و تابعین کے اقوال مختلف پاتے تو اپنے شہر کے مذہب اور اپنے دیار کے علماء و فقہا کو زیادہ لائق اعتماد اور زیادہ قابل اتباع سمجھتے۔ چنانچہ اہل مدینہ حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت عائشہؓ، ابن عباسؓ، زید بن ثابتؓ، سعید بن مسیب، عروہ، سالم، عطا بن یسار، قاسم، زہری، یحییٰ بن سعید، زید بن اسلم، اور ربیعہ وغیرہ کے اقوال کو دوسروں

پر ترجیح دیتے ہیں اور حضرت امام مالک کی تمام فقہ انہی حضرات کی روایات و آثار اور ان ہی کے عمل و اجتہاد پر قائم ہے۔

اسکے برعکس اہل کوفہ عبداللہ بن مسعودؓ اور ان کے اصحاب کے مذہب، حضرت علیؓ اور قاضی شریح اور شعبی کے فیصلوں اور ابراہیم نخعی کے فتووں کو ترجیح دیتے ہیں اور اس معاملہ میں ان لوگوں کو جس قدر اصرار ہے اس کا اندازہ ان اقوال سے ہو سکتا ہے جو اوپر گذر چکے ہیں۔

مذکورہ بالا رجحانات کے ساتھ فقہا کے دور کا آغاز ہوا اور ہمارے دین میں تین مستقل فقہوں کی بنیاد پڑی جن کا ہم یہاں مختصراً ان کی خصوصیات کے ساتھ ذکر کریں گے۔

**فقہ مالکی** فقہ مالکی کے امام حضرت امام مالکؒ ہیں[۱]۔ امام مالکؒ اہل مدینہ کے علم و عمل، حضرت عمرؓ کے فیصلوں، عبداللہ بن عمرؓ، حضرت عائشہؓ اور دوسرے صحابہ کبار کے اقوال و اجتہادات کے سب سے بڑے عالم تھے۔ جب اللہ تعالیٰ نے ان کو درس و افتا کی مسند پر سرفراز فرمایا تو انہی اکابر دین کا علم و عمل امام مالکؒ کی تحقیق و تنقید، روایت و درایت اور اجتہاد و تفقہ سے جلا پاکر ان کے اصحاب کو ورثہ میں ملا۔ انھوں نے اس کی شرح و تلخیص کی، ان کے اصولوں پر مسائل کی تخریج کی اور ان کے قواعد و ضوابط منضبط کئے اور پھر انہی کی کوششوں سے مغرب اور ممالک اسلامی کے بعض دوسرے حصوں میں اس کو فروغ ہوا۔

**فقہ حنفی** فقہ حنفی کے امام حضرت امام ابو حنیفہؒ ہیں[۲]۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ ابراہیم نخعی اور ان کے اصحاب کے مذہب کے عالم تھے اور ابراہیم نخعی اور ان کے اصحاب کے مذہب ہی کو اپنے تمام اجتہادات و تخریجات میں بطور اصول کے پیش نظر رکھتے تھے حضرت

[۱] ولادت ۹۳ھ وفات ۱۷۹ھ [۲] ولادت ۸۰ھ وفات ۱۵۰ھ

شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے حجۃ اللہ البالغہ اور رسالہ الانصاف فی بیان سبب الاختلاف دونوں میں یہ بات لکھی ہے کہ "اگر ابراہیم نخعی اور ان کے اصحاب اور ہم عصروں کے اقوال امام محمد کی کتاب الآثار، جامع عبدالرزاق، مصنف ابی بکر بن شیبہ سے جمع کر لو اور امام صاحب کے اقوال کا ان سے موازنہ کرو تو تمھیں یہ بات معلوم ہو گی کہ وہ اپنے اجتہادات میں ان لوگوں کے طریقہ سے بہت کم الگ ہوتے ہیں اگر کہیں الگ ہوتے بھی ہیں تو فقہائے کوفہ ہی کے دائرہ کے اندر رہتے ہیں۔ ان کے دائرہ سے باہر نہیں نکلتے۔"

امام صاحب کے شاگردوں میں دو صاحب بہت نامور ہوئے ہیں۔ ایک قاضی ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ۔ دوسرے امام محمد رحمۃ اللہ علیہ۔

قاضی ابو یوسف صاحب ہارون الرشید کے عہد میں قاضی القضاۃ کے عہدہ پر مقرر ہوئے اور اس طرح وہ عراق، خراسان اور ماوراء النہر وغیرہ میں امام صاحب کی فقہ کے پھیلنے کا واسطہ بنے۔

امام محمد صاحب نے پہلے امام صاحب سے فقہ کی تحصیل کی۔ پھر مدینہ جا کر امام مالک سے موطا پڑھی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس کے بعد انھوں نے خود فقہ حنفی کے تمام مسائل کو ایک ایک کر کے موطا پر تولا۔ جو مسائل دونوں میں متفق علیہ نکلے وہ تو خارج از بحث تھے لیکن جن مسائل میں انھوں نے اختلاف پایا ان میں انہوں نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ جس مسئلہ میں صحابہ و تابعین کی کوئی جماعت انھوں نے اپنے پہلو پر بھی پائی اس کو تو اختیار کر لیا اور جس مسئلہ کو دیکھا کہ محض کمزور تخریج اور ضعیف قیاس پر مبنی ہے، حدیث صحیح اور اکثر صحابہ کا عمل اس کے

خلاف ہے، اس میں سلف کے مختلف مذاہب میں سے جو مذہب ان کو اس وقت لائق ترجیح
نظر آیا اس کو اختیار کر لیا۔

اس پہلو سے دیکھئے تو قاضی ابو یوسف صاحب اور امام محمد صاحب اصحاب اجتہاد میں سے
ہیں لیکن چونکہ یہ دونوں حضرات بالعموم امام نخعی اور ان کے اصحاب کے مذاہب اور ان کے طریقہ
اجتہاد سے الگ نہیں ہوتے اسلئے ان کو فقہ حنفی کے پیروؤں میں شمار کیا جاتا ہے۔

**فقہ شافعی**

فقہ کے مذکورہ بالا دونوں اسکول ابھی اپنی ترتیب و تدوین کے پہلے مرحلہ ہی
میں تھے کہ حضرت امام شافعی کا ظہور ہوا۔ انہوں نے ان لوگوں کے طریق
استنباط و اجتہاد پر غور کیا تو ان کو نظر آیا کہ اس میں کچھ خامیاں ہیں۔ ان خامیوں کو دور کرنے
کیلئے انہوں نے اجتہاد و استنباط اور اصول و فروع کی ترتیب و تدوین کے نئے ضابطے
مرتب کئے۔ اس سلسلہ میں جو خاص باتیں انھوں نے پیش نظر رکھیں ان کا انھوں نے کتاب الام
کے شروع میں ذکر فرمایا ہے۔ ہم شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے واسطے سے یہاں ان میں
سے بعض باتیں بیان کریں گے تاکہ واضح ہو سکے کہ یہ اسکول مالکی اور حنفی سکول سے کن امور
میں الگ ہے اور ان کی نوعیت کیا ہے؟

**شافعی اسکول کی بعض خصوصیات**

شافعی اسکول جن خاص خاص باتوں میں مالکی اور
حنفی اسکول سے الگ ہے وہ بالاجمال یہ ہیں:-

۱- اوپر یہ گذر چکا ہے کہ مالکی اور حنفی اسکول کے لوگ مرسل و منقطع روایات آزادی
سے لے لیتے تھے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ[1] نے اس آزادی کو روکا۔ ان کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ

---

[1] ولادت ۱۵۰ھ وفات ۲۰۴ھ

جب حدیث کے تمام طریقوں کو جمع کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ بہت سی مرسل روایات بالکل بے اصل ہیں۔ نیز بعض مرسل روایات مسند روایات کی مخالف بھی پڑتی ہیں جس سے دین میں خلل واقع ہوتا ہے۔ اس خرابی سے بچنے کے لئے امام صاحب نے مرسل روایات کے قبول کرنے کے لئے کچھ شرطیں قائم کیں جو اصول کی کتابوں میں مذکور ہیں۔ یہاں ان کی تفصیل کی گنجائش نہیں ہے۔

۲۔ مالکی اور حنفی اسکول کے لوگوں کے پاس روایات کے جمع و تطبیق کے لئے منضبط قاعدے نہیں تھے جس کے سبب سے ان کے اجتہادات میں بسا اوقات خلل واقع ہوتا تھا۔ امام شافعی نے روایات کے جمع و تطبیق کے قاعدے مرتب کئے اور اس خلل کی راہ بند کرنے کرنے کی کوشش کی چنانچہ وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے اصول فقہ میں کتاب لکھی۔

۳۔ تیسری بات یہ ہے کہ علمائے تابعین میں سے جو لوگ عدالت اور افتا کی خدمات پر مامور ہوئے ان میں سے بعض لوگوں کو بعض حدیثیں نہیں پہنچیں۔ ایسی حالت میں جب ان کے سامنے کوئی ایسی صورت آئی جس سے متعلق حدیث ان کے علم میں نہیں تھی تو انہوں نے اس صورت کے لیے صحابہ کے فتوؤں یا عام اصولِ شریعت کی روشنی میں اپنے اجتہاد سے کوئی بات اخذ کر کے فتوی دے دیا۔ بعد میں تیسرے طبقہ میں آکر جب وہ حدیثیں ظاہر ہوئیں جو پہلے ان کے علم میں نہیں آئی تھیں تو انہوں نے ان حدیثوں کو اس بنا پر نہیں لیا کہ یہ ان کے شہر کے لوگوں کے مروجہ عمل اور مذہب کے خلاف تھیں کیونکہ اس چیز کو یہ حضرات، جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے، حدیث کے لئے ایک وجہ اعتراض سمجھتے تھے۔

اسی طرح بعض ایسی حدیثیں بھی ان کی نظر سے رہ گئیں جو تیسرے طبقہ میں بھی ظاہر نہیں ہوئیں بلکہ بعد میں اس وقت ظاہر ہوئی ہیں جبکہ ارباب حدیث نے گوشہ گوشہ چھان کر تمام روایات اور ان کے تمام طریقوں کا سراغ لگایا ہے۔ اور ایک ایک شیخ کو معلوم کر کے اسکی تمام روایات کو منظر عام پر لائے ہیں۔

اس قسم کی روایات کے بارہ میں امام شافعی صاحب نے یہ مذہب اختیار کیا کہ کسی علاقہ کے لوگوں کا ان روایات کو نہ لینا ان روایات کے نقص کی کوئی دلیل نہیں بن سکتا۔ صحابہ اور تابعین کا طریقہ یہ تھا کہ وہ ہر مسئلہ میں کتاب اللہ کے بعد حدیث کو تلاش کرتے تھے۔ جب حدیث نہ پاتے تب استدلال کے دوسرے طریقوں سے کام لیتے اور بعد میں جب ان کو حدیث مل جاتی تو اپنے اجتہاد سے رجوع کر کے اس حدیث کو اختیار کر لیتے۔ پس ان کا مجرد کسی حدیث کو نہ لینا اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ فی نفسہ اس حدیث میں کوئی خرابی ہے۔ حدیث میں کوئی خرابی اس وقت مانی جائے گی جب انھوں نے اس کو بیان کیا ہو۔ امام شافعی کے اسی اصول کی بنا پر قلتیں اور خیار مجلس والی حدیثوں میں ان کا مذہب امام مالک اور امام ابو حنیفہ کے مذہب سے بالکل الگ ہوا اور ان کے متعلق متاخرین کی معرکہ آرائیاں حدیث و فقہ کے طلبہ کو اچھی طرح معلوم ہیں۔

۴- چوتھی چیز یہ ہے کہ امام شافعیؒ کے زمانہ میں جب صحابہؓ کے اقوال و آثار اکٹھا ہوئے تو نظر آیا کہ ان میں بہت کچھ اختلاف ہے اور چونکہ بعض لوگوں کو بعض صحیح حدیثیں پہنچ نہیں سکی ہیں اس وجہ سے بہت سے اقوال حدیث صحیح کے خلاف بھی ہیں۔ ایسی صورت میں سلف کا مذہب یہ رہا ہے کہ حدیث صحیح مل جانے کے بعد اس کو اختیار

کر لیتے رہے ہیں اس لئے امام شافعیؒ نے صحابہؓ کے اختلاف کی صورت میں ان کے اقوال سے استناد کو صحیح نہیں سمجھا اور فرمایا کہ ہم رجال ونحن رجال وہ بھی آدمی ہیں اور ہم بھی آدمی ہیں۔

۵۔ پانچویں بات یہ ہے کہ بعض فقہا امام شافعیؒ کے نزدیک رائے اور قیاس شرعی میں فرق نہیں کرتے تھے اور اس طرح کی رائے کو جو قیاس شرعی سے بالکل ہی مختلف چیز ہے دین میں داخل کر دیتے تھے اور اس کو استحسان کہتے تھے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اس استحسان کی شدت سے مخالفت کی اور فرمایا کہ من استحسن فانہ اراد ان یکون شارعًا جو شخص اس طرح کا استحسان کرتا ہے وہ درحقیقت مستقل شارع بننا چاہتا ہے۔

اس تفصیل سے ہماری فقہ کے تینوں اسکولوں کا فرق واختلاف ایک حد تک واضح ہوگیا۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی حیثیت درحقیقت ایک جامع رابطہ کی ہے۔ فقہ کے جو اسکول اپنے اپنے دیار کے علماء وفقہا کو لے کر سمٹ گئے تھے، روایات وآثار کے پھیلنے کے بعد امام شافعی نے یہ کوشش کی کہ وہ اپنے اپنے دیار کے علماء پر قناعت کر لینے کے بجائے روایات وآثار کے پورے ذخیرہ سے فائدہ اٹھائیں اور سلف کے طریق پر روایات مل جانے کی صورت میں اپنے قیاسات واجتہادات سے دست بردار ہو جائیں، ہر شخص کے پیش نظر صرف کتاب وسنت ہو، کسی خاص علاقہ کے علماء کے اجتہادات کو ترجیح دینے کی خواہش کار فرما نہ ہو۔

غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی یہ کوشش امت کے اتحاد اور کتاب وسنت کے ساتھ ہماری وابستگی کے نقطۂ نظر سے بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ اس میں شبہ نہیں

ہے کہ اپنے اپنے دیار کے علماء پر اعتماد کرنے کی تحریک ابتداءً محض طلب حق کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی۔ لوگ جن لوگوں کے علم و تقویٰ پر زیادہ بھروسہ رکھتے تھے اور جن سے زیادہ واقف تھے، دین کا علم انہی سے حاصل کرنا چاہتے تھے اور ایسا کرنے میں وہ حق بجانب تھے لیکن یہی چیز بعد میں مذہبی گروہ بندیوں کی بنیاد بن سکتی تھی اس وجہ سے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کوشش کی کہ اس فتنہ کی جڑیں مضبوط ہونے سے پہلے ہی اس پر ضرب لگا دیں۔ چنانچہ انھوں نے ایسا ہی کیا اور ہر شخص اعتراف کرے گا کہ اس سلسلہ میں ان کی کوششیں مجاہدانہ شان رکھتی ہیں۔

اسی طرح استحسان کی مخالفت کر کے امام شافعی نے اسلامی قانون کی اصلی روح کی حفاظت کرنے کی کوشش فرمائی۔ اسلامی قانون کی اصلی روح یہ ہے کہ وہ خدا اور اسکے رسول کی تصریحات پر مبنی ہو اور اگر کسی امر میں خدا اور اسکے رسول کی کوئی تصریح موجود نہ ہو تو یہ ضروری ہے کہ اس مسئلہ کا حل قیاس شرعی کے مطابق نکالا جائے۔ اس معاملہ میں محض اپنے ذوق یا رجحان طبع کو دخل انداز نہ ہونے دیا جائے ورنہ اس بات کا اندیشہ ہے کہ دین اپنے اجزا اور فروع میں اپنی اصل سے کٹ جائے گا جس کے معنی دوسرے لفظوں میں یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ ہم اپنی زندگی کے ایک حصہ میں خدا کی حاکمیت کے جو حقوق ہیں ان سے منحرف ہو جائیں۔

امام شافعی صاحب نے جو عظیم الشان خدمت امت کو متحد رکھنے اور علم دین میں توفیق و تطبیق پیدا کرنے کے سلسلہ میں انجام دی ہے اس کا ایک سرسری اندازہ شاہ ولی اللہ

صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی مندرجہ ذیل سطروں سے ہو سکیگا۔

"اگلوں کے سامنے صرف ان کے شہر کی احادیث و آثار کا ذخیرہ ہوتا تھا۔ اس وقت تک تمام بلاد کی حدیثیں اکٹھی نہیں ہوئی تھیں جب کبھی کوئی ایسی صورت پیش آجاتی کہ ان کے شہر کے ذخیرہ احادیث میں دلیلیں متعارض ہو جاتیں تو وہ عام فہم و فراست سے کام لے کر اس تعارض کو دفع کر دیتے۔ لیکن امام شافعی کے زمانہ میں تمام بلاد اسلامیہ کی حدیثیں اکٹھی ہو گئیں اور ان حدیثوں اور ان علاقوں کے فقہا کے اقوال و مختارات میں دوہرے قسم کا تعارض نظر آیا۔ ایک طرف تو ایک شہر کی حدیثیں دوسرے شہر کی حدیثوں سے متعارض ملیں اور دوسری طرف ایک ہی شہر کی حدیثیں باہم دگر متعارض نظر آئیں۔ ایسی صورتوں میں دوسروں کا مذہب بالعموم یہ تھا کہ اپنے اپنے شیخ کے مذہب پر قانع ہو گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ امام شافعی کے زمانہ میں اختلافات کا ایسا طوفان امنڈ پڑا جس کا گمان بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ لوگ بالکل حیران و ششدر ہو کے رہ گئے۔ کسی طرف راہ نہیں پاتے تھے کہ تائید ربانی ظاہر ہوئی اور امام شافعی کو ان مختلف اقوال میں جمع و تطبیق کے قواعد الہام ہوئے اور انہوں نے اپنے بعد والوں کے لئے دروازہ کھول دیا اور سبحان اللہ کیسا دروازہ کھولا۔"

# اہل حدیث اور اصحاب فقہ کا اختلاف

ہماری فقہ کے مختلف اسکول درجہ بدرجہ جس طرح قائم ہوئے اور ان میں جس قسم کا اختلاف جن اسباب سے پیدا ہوا اسکی تفصیل اوپر بیان ہو چکی ہے لیکن ابھی اہل حدیث اور اصحاب الرائے (فقہ) کے اختلاف کی نوعیت معلوم کرنا باقی ہے اور مناسب ہے کہ مختصراً اس اختلاف کی حقیقت بھی واضح کر دی جائے۔

ہمارے نزدیک جو اسباب حنفی اور مالکی فقہ کے ہوتے ہوئے شافعی مذہب کے قیام کے باعث ہوئے بعینہ وہی اسباب ان تینوں مذاہب کے ہوتے ہوئے مذہب اہل حدیث کے قیام کے باعث ہوئے۔ ایک گروہ کے اندر تلاش احادیث کی سرگرمی برابر جاری رہی اور اس کے پاس احادیث کا ایسا ذخیرہ جمع ہو گیا جو اس سے پہلے کسی گروہ کے پاس جمع نہیں ہوا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس گروہ نے نئی ظاہر شدہ حدیثوں کو اپنے علم و عمل کا جزو بنایا اور ان کو اختیار کرنے پر اسی طرح زور دینا شروع کیا جس طرح امام شافعی رح نے اپنے زمانہ میں نئی حدیثوں کے اختیار کرنے پر زور دیا تھا اور یہ مطالبہ کیا تھا کہ جن امور کے بارہ میں حدیثیں علم میں آ چکی ہیں ان کے بارہ میں لوگوں کے اقوال و آثار کی پیروی نہ کی جائے۔

اس گروہ نے بڑے زور و قوت کے ساتھ اپنے نقطہ نظر کی حمایت میں یہ دلیل پیش کی کہ سلف میں یہ بات بالکل متفق علیہ رہی ہے کہ جب سنت رسول کسی چیز کے بارہ میں موجود ہو تو اس میں رائے اور اجتہاد کو دخل نہ دیا جائے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے متعلق روایت ہے کہ جب ان سے کسی چیز کی بابت سوال کیا جاتا تو محض اس اندیشہ کی وجہ سے کہ ممکن ہے

جس چیز کے بارہ میں ان سے سوال کیا گیا ہے اس کے بارہ میں وہ لاعلمی کے باعث کوئی فتوے رسول کے خلاف دے بیٹھیں، فتوی دینے ہی سے گریز کرتے اور فرماتے کہ میں اس بات کو ناپسند کرتا ہوں کہ تمہارے لئے کوئی ایسی چیز حلال کردوں جو اللہ نے حرام کی ہو یا کوئی ایسی چیز حرام کردوں جو اللہ نے حلال کی ہو صحابہؓ فرضی صورتوں کے لئے پیشگی فتوی دینے سے بھی احتراز کرتے تھے کیونکہ انہیں یہ گمان تھا کہ اللہ اور اسکے رسول کے علم کو ظاہر کرنے والے برابر پیدا ہوتے رہیں گے، اس لئے یہ کچھ اچھی بات نہیں ہے کہ بے ضرورت پہلے ہی سے فرضی صورتوں کے لئے اجتہادات کر لیے جائیں، ممکن ہے جس چیز کے بارہ میں آج ہم اپنے اجتہاد سے ایک فیصلہ کر رہے ہیں کل اسکے بارہ میں رسول کی کوئی حدیث ظاہر ہو جائے اور وہ ہمارے اس اجتہاد کے خلاف ہو۔ چنانچہ حضرت معاذ بن جبلؓ فرمایا کرتے تھے کہ کسی معاملہ کے بارہ میں اس کے پیش آنے سے پہلے جلدی نہ مچایا کرو، مسلمانوں میں ایسے لوگ برابر پیدا ہوتے رہیں گے جو پیش آنے والی صورتوں میں شریعت کی ٹھیک راہ پالیا کریں گے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے جابر بن زیدؓ سے فرمایا کہ صرف قرآن اور سنت کے مطابق فتویٰ دیا کرو، اگر اس راہ سے ہٹے تو خود بھی ہلاک ہوگے اور دوسروں کو بھی ہلاک کروگے۔ ابو سلمہؓ نے حضرت حسنؓ سے کہا کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ اپنی رائے سے فتوے دے دیا کرتے ہیں، ایسا نہ کیا کیجئے، ہمیشہ سنت رسول اور کتاب اللہ کے مطابق فتویٰ دیا کیجئے۔ ابن منکدرؓ سے روایت ہے کہ ایک عالم اللہ اور اسکے بندوں کے بیچ میں دخل دیتا ہے پس اسے اپنے لئے راہ تلاش کر رکھنی چاہئے۔ شعبی سے پوچھا گیا کہ جب آپ لوگوں کے سامنے کوئی مسئلہ آتا تو آپ

لوگ کیا کرتے تھے، انہوں نے فرمایا کہ تم نے جاننے والے سے بات پوچھی۔ ہم میں سے جب کسی سے کوئی بات پوچھی جاتی تو وہ جواب کے لئے اپنے ساتھی کی طرف اشارہ کرتا اور وہ دوسرے کی طرف اشارہ کرتا، یہاں تک کہ معاملہ پھر پھرا کے پہلے کی طرف لوٹ آتا۔

یہی حدیثیں اور یہی اقوال ہیں جن کی تحریک نے امام شافعیؒ کو آمادہ کیا کہ وہ مالکی اور حنفی اسکول کے اجتہادات پر قانع نہ ہو جائیں بلکہ احادیث و آثار کا جو ذخیرہ ظاہر ہوتا جارہا ہے اس سے خود بھی فائدہ اٹھائیں اور دوسروں کو بھی دعوت دیں کہ وہ بھی اس سے فائدہ اٹھائیں اور انہی کی تحریک سے ایک جماعت کے اندر تلاش حدیث کی سرگرمی برابر جاری رہی اور اس جماعت نے حجاز، شام، عراق، مصر، یمن اور خراسان وغیرہ کے گوشہ گوشہ کو چھان کر احادیث و آثار کو فراہم کیا۔ ان کی تحقیق و تنقید کی اور ان کی غرابت و شہرت کے درجے قائم کئے۔

یہی جماعت ہے جو اہل حدیث کے نام سے موسوم ہوئی۔ اس جماعت کے اکابر عبدالرحمان بن مہدی، یحییٰ قطان، یزید بن ہارون، عبدالرزاق، ابوبکر بن ابی شیبہ، مسدد، ہناد، احمد بن حنبل، اسحاق بن راہویہ، فضل بن دکین اور علی مدینی وغیرہ ہیں۔

ان حضرات نے فن روایت اور درجات حدیث کو مرتب کر لینے کے بعد فقہ کی طرف توجہ فرمائی۔ فقہ کے بارہ میں ان لوگوں نے بنیادی اصول یہ قرار دیا کہ فقہ کے سابق مذاہب میں سے کوئی ایک مذہب بھی ایسا نہیں ہے جو بعض مسائل میں احادیث و آثار سے تناقض نہ رکھتا ہو۔ اس لئے کسی ایک متعین شخص کی تقلید صحیح نہیں ہے۔ چنانچہ یہ حضرات

ہر حالت کے لئے احادیث نبویؐ اور آثار صحابہؓ و تابعین کی رہنمائی تلاش کرتے تھے اور اسکے لئے انھوں نے اپنے سامنے ایک خاص ضابطہ رکھا تھا جس کے بنیادی اصول شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے بیان کے مطابق یہ ہیں :-

۱۔ جس امر کے بارہ میں قرآن میں کوئی رہنمائی موجود ہو اس امر کے بارہ میں قرآن سے کسی حال میں ہٹنا جائز نہیں ہے۔

۲۔ جس امر کے بارہ میں قرآن کا حکم مختلف پہلوؤں کا احتمال رکھتا ہو اس امر کے بارہ میں فیصلہ کن چیز سنت ہو گی۔

۳۔ جس امر کے بارہ میں کتاب اللہ خاموش ہو اس امر کے بارہ میں سنت رسول اللہ کی پیروی کی جائے۔ خواہ یہ سنت علماء اور فقہائے کے درمیان شہرت رکھتی ہو یا کسی خاص شہر، کسی خاص خاندان اور کسی خاص طریق کے ساتھ اختصاص رکھتی ہو۔ نیز صحابہؓ اور فقہائے نے اس پر عمل کیا ہو یا نہ کیا ہو۔

۴۔ جس مسئلہ میں حدیث موجود ہو اس میں اسکے خلاف کسی اثر اور اجتہاد کی پیروی نہ کی جائے۔

۵۔ تلاش کے باوجود اگر کسی مسئلہ میں حدیث نہ ملے تو اس میں صحابہ و تابعین کے اقوال کی بلا امتیاز قوم و شہر پیروی کی جائے۔ اگر کسی رائے پر جمہور خلفاء اور فقہاء متفق ہیں تو وہ سب پر مقدم ہے اور اگر ان میں اختلاف ہو تو اس کا مسلک اختیار کیا جائے جو ان میں سب سے بڑا عالم اور سب سے زیادہ متقی ہو۔ اور اگر اس پہلو سے دو مسلک بالکل مساوی درجہ کے ہوں تو

دونوں مسلک لائق اختیار قرار دیے جائیں۔

اگر ان تمام صورتوں میں سے کوئی صورت بھی موجود نہ ہو تو کتاب و سنت کے عموم اور ان کے اشارہ و اقتضاء کی روشنی میں کوئی بات شرع سے لگتی ہوئی اختیار کی جائے۔

ان اصولوں پر غور کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ نہ صرف امام شافعی رح اور اہل حدیث کے اصولوں میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے بلکہ امام ابو حنیفہ رح اور امام مالک رح نے جو اصول اختیار کئے ہیں ان میں اور اہل حدیث کے ان اصولوں میں بھی کوئی ایسا بنیادی فرق نہیں ہے۔ یہ حقیقت ان تینوں مذاہب میں بالکل متفق علیہ ہے کہ سنت رسول کی موجودگی میں دوسروں کی قیل و قال کو اہمیت نہ دی جائے۔ پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر ان تینوں مذاہب میں اختلاف کی خلیج اتنی وسیع کس طرح ہو گئی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ اختلاف ان مذاہب کے اصولوں کے اختلاف کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ یہ نتیجہ ہے زیادہ تر اس بات کا کہ ہر مذہب کے پیروؤں نے اپنے اصلی اصولوں سے ہٹ کر بیجا کھینچ تان کی ہے جس کے سبب سے یہ اختلاف کی خلیج وسیع ہوئی ہے۔

ایک طرف تو اہل فقہ نے اپنے اپنے دیار کے علماء و فقہاء کو جو اہمیت دینی شروع کی تو یہ اس قدر بڑھی کہ ان کے قرار دادہ اصول بجائے خود دین کا ماخذ بنا دیئے گئے۔ ان اصولوں کی روشنی میں مسائل کی تخریج کی جانے لگی اور پھر ایک قدم اور آگے بڑھا کر تخریج در تخریج کا دروازہ کھول دیا گیا اور کسی ایک متعین فقہ کے اصولوں پر اجتہاد کرنے والے پیدا ہونے لگے جو مجتہد فی المذہب کہے جاتے ان کے لئے براہ راست کتاب و سنت سے

ربط قائم رکھنے کی چنداں ضرورت نہیں محسوس کی جاتی تھی بلکہ ان کے لئے یہ بات کافی تھی کہ وہ اپنے ائمہ کی کتابوں اور ان کے اجتہادات اور فتووں کو یاد رکھیں اور جب ان کے سامنے کوئی سوال آئے تو اپنے محفوظ ذخیرہ کی جزئیات سے اور اگر یہ صورت ممکن نہ ہو تو اسکے عموم و اقتضا کی روشنی میں اجتہاد کر کے القول المخرّج علی مذہب فلاں کہہ کر سائل پر دین کی حجت تمام کر دیں۔ آہستہ آہستہ اس چیز نے اتنی وسعت پکڑی کہ کتاب و سنت دین کے ماخذ و مصدر صرف عالم خیال میں رہ گئے۔ ان کی جگہ آئمہ کے قرار داد اصولوں اور ان کے اجتہادات نے لے لی چنانچہ یہ بات ایک اصول کے طور پر تسلیم کر لی گئی کہ من حفظ المبسوط کان مجتہدا جس نے مبسوط حفظ کر لی وہ مجتہد بن گیا۔

دوسری طرف محدثین کو اپنے اصولوں کی پاسداری میں (جو یقیناً منصوص نہ تھے بلکہ آئمہ حدیث کے اپنے ٹھہرائے ہوئے تھے) اتنا غلو ہوا کہ کسی کی تخریج کو تسلیم کرنا تو الگ رہا انھوں نے خود روایت کے اخذ و قبول میں بسا اوقات انصاف کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیا۔ ابن حزم نے ارسال و انقطاع کے معمولی شائبہ کی بنا پر بہت سی روایات رد کر دیں۔ اسی طرح کسی راوی کی نسبت اگر یہ طے کر لیا گیا کہ وہ فلاں شیخ کی حدیثوں کا سب سے زیادہ محفوظ واسطہ ہے تو پھر اسکے علاوہ کسی دوسرے واسطہ میں ہزار وجہ ترجیح موجود ہو لیکن وہ ان حضرات کے نزدیک لائق قبول نہیں۔

غرض ایک طرف تخریج سے قطعی انکار اور دوسری طرف تخریج کا یہ زور کہ اسکے

سامنے صاف اور صریح احادیث بالکل ہیچ۔ حالانکہ انصاف، جیسا کہ حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا ہے، یہ ہے کہ دین میں ان دونوں کی جگہ ہے اور ان میں سے کسی سے بھی بے پروا ہونا ممکن نہیں ہے۔ نہ تو روایات ہی کو چھوڑا جا سکتا ہے اور نہ تخریج کی ضرورت ہی سے انکار کیا جا سکتا ہے۔ صحیح راہ صرف یہ ہے کہ ایک کے نقص کی دوسرے سے تلافی کی جائے۔ اہل تخریج سنن و آثار کا ایسا اہتمام کریں کہ کسی حدیث صحیح کی مخالفت کی ذمہ داری ان پر عائد نہ ہو۔ اسی طرح ارباب حدیث اپنے ائمہ کے قرار دادہ اصولوں کی حمایت میں اس قدر غلو کو راہ نہ دیں کہ خود حدیث یا قیاس صحیح کی بھی ان کے آگے کوئی قدر و قیمت باقی نہ رہ جائے۔ اس طرح جب ہر طرف سے افراط و تفریط کے کج پیچ نکل جائیں گے تو آپ سے آپ ایک معتدل اور متفق علیہ صورت سب کو جمع کر دینے والی نکل آئے گی۔

اس اختلاف و نزاع کے دور میں بیچ کی صلاح سلیمان خطابی نے متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے معالم السنن سے اس کا خلاصہ نقل کیا ہے۔ ہم اسکے ضروری اقتباسات یہاں پیش کرتے ہیں۔

"ہمارے زمانہ کے اہل علم دو حصوں میں بٹ گئے ہیں۔ ایک اصحاب حدیث و اثر ہیں۔ دوسرے ارباب فقہ و نظر۔ جہاں تک ان کی ضرورت و اہمیت کا تعلق ہے ان میں سے کوئی بھی ایک دوسرے سے کم نہیں۔ کیونکہ حدیث بمنزلہ بنیاد کے اور فقہ بمنزلہ عمارت کے ہے جس طرح وہ عمارت جو بغیر بنیاد کے بنائی جائے گی گر جائے گی، اسی طرح وہ بنیاد جو عمارت سے محروم رہے گی وہ

ایک ویرانہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھے گی"

دونوں گروہوں کی قدر و منزلت اور ان کی ضرورت و اہمیت کے اعتراف اور ان کے درمیان اتحاد و اتفاق کی تمنا ظاہر کرنے کے بعد ابو سلیمان خطابی نے دونوں کی خامیوں کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے :۔

"رہا یہ طبقہ یعنی اہل حدیث تو ان میں سے اکثر کی جد و جہد کا منتہا صرف یہ ہے کہ حدیثیں جمع کی جائیں ۔ ان کو اس سے زیادہ بحث نہیں ہے کہ وہ حدیثیں کس قسم کی ہیں ۔ بسا اوقات وہ غریب و شاذ حدیثیں بھی جمع کر لیتے ہیں جن کا بڑا حصہ بالکل موضوع یا مقلوب ہوتا ہے ۔ یہ نہ تو متن کا اہتمام کرتے اور نہ ان کے معانی و مطالب کو اچھی طرح سمجھنے کی کوشش کرتے البتہ فقہا پر اعتراض و نکتہ چینی اور ان پر سنت کی مخالفت کا الزام عاید کرتے رہتے ہیں اور انہیں بالکل خبر نہیں ہے کہ یہ لوگ ان کے مبلغ علم سے یکسر محروم ہیں اور ان کو برا بھلا کہہ کر اپنے کو گنہگار کر رہے ہیں ۔"

اسکے بعد فقہائے کرام کی غفلت و کوتاہی پر ان الفاظ میں تنقید کی ہے :۔

"رہا دوسرا طبقہ یعنی ارباب فقہ و نظر کا تو یہ حدیثوں کی طرف بہت کم توجہ کرتا ہے یہ ان کے صحیح و سقیم میں امتیاز کی کوئی کوشش نہیں کرتے ۔ جو حدیثیں ان کو پہنچی ہیں اگر وہ ان کے خیالات و معتقدات کے موافق ہوئیں تو یہ ان سے اپنے حریفوں کے خلاف حجت پیش کرنے میں ذرا بھی تکلف سے کام

نہیں ہیں گے ضعیف و منقطع روایتیں قبول کر لینے میں یہ حضرات نہایت بے پروا ہیں۔ اور اس بے پروائی پران لوگوں نے کچھ ایکا سا کر لیا ہے۔ بشرطیکہ وہ حدیثیں ان کے درمیان شہرت پکڑ جائیں اور ان کی زبانوں پر چڑھ جائیں۔ اگرچہ ان کا ذریعہ کتنا ہی ناقابل اعتماد ہو اور ان میں راوی کی لغزش کا کتنا ہی احتمال ہو۔ حالانکہ ان حضرات سے اگر خود ان کے ائمہ کے کسی اجتہاد کی بابت روایت کی جائے تو گو معاملہ بالکل اجتہادی ہوگا لیکن اس میں راوی کی ثقاہت کا سوال اُٹھائیں گے۔ اصحاب مالک اپنے مذہب کے بارہ میں صرف ابن قاسم اور اشہب اور ان جیسے اکابر اصحاب ہی کی روایت پر اعتماد کرتے ہیں۔ اگر کوئی روایت ان کے سامنے عبداللہ بن عبدالحکیم وغیرہ کے واسطہ سے آئے تو اس کو ہرگز لائق توجہ نہیں قرار دیں گے۔ اسی طرح اصحاب ابوحنیفہ کا تمام تر اعتماد قاضی ابو یوسف اور محمد بن حسن اور ان جیسے اکابر اصحاب کی روایات پر ہے۔ اگر کوئی روایت حسن بن زیاد لولئی وغیرہ کے واسطہ سے ان بزرگوں کے خلاف پیش کی جائے تو اس کو ہرگز نہیں باور کریں گے۔ یہی حال امام شافعی کے اصحاب کا ہے۔ اپنے مذہب کے بارہ میں ان حضرات کا تمام تر اعتماد مزنی اور ربیع بن سلیمان مرادی کی روایات پر ہے۔ اگر خزیمہ اور جرمی وغیرہ سے کوئی روایت کی جائے تو اس کو ہرگز تسلیم نہ کریں گے۔ یہی حال تمام آئمہ کے اصحاب کا ہے۔ ان میں سے کوئی بھی اپنے مذہب کے بارہ میں کوئی روایت

قبول کرنے میں بے پروائی اور سہل انکاری سے کام نہیں لیتا ہے پھر جب اپنے شیوخ سے روایت کرنے میں ان کے اہتمام کا یہ حال ہے اور جزئیات و فروع کے معاملہ میں یہ لوگ اس درجہ چھان بین سے کام لیتے ہیں تو حیرت ہے کہ ایک اہم ترین اور عظیم ترین معاملہ میں یہ تساہل کو کیوں راہ دیتے ہیں؟ ان کے لئے یہ بات کیسے جائز ہو سکتی ہے کہ امام الائمہ، رسول رب العزت سے نقل و روایت کرنے میں بے پروائی سے کام لیں حالانکہ ان کے ہر حکم کی اطاعت ہم پر واجب اور ہر امر کی فرمانبرداری ہم پر لازم ہے! ........ اگر کوئی شخص اپنے ذاتی معاملات میں بے پروائی سے کام لینے کا عادی ہو اور اپنے قرضداروں سے کھرے کھوٹے ہر طرح کے سکے قبول کر لیا کرے تو یہ تو ایک بات ہوئی لیکن جب وہ کسی کمزور کا ولی، کسی یتیم کا نگراں اور کسی غائب کا وکیل ہے تو ایسی حالت میں اس کی ادنیٰ بے پروائی بھی خیانت کے ہم معنی ہے ......"

اسکے بعد متاخرین فقہاء کے حال پر ان تند و تلخ الفاظ میں تنقید کی ہے۔

"بعد میں ایسے لوگ آئے جن کو طلب حق کی راہ دشوار معلوم ہوئی۔ انھوں نے راحت کو پسند کیا اور جلد بازی کو ترجیح دی اور علم کے راستہ کو مختصر کر کے نہ اصول فقہ کے چند الفاظ و حروف پر قانع ہو گئے۔ ان کا نام علل رکھ لیا اور علم کی نمائش کے لئے ان کو شعار، حریفوں سے مناظرہ و مجادلہ کے لئے ان کو سپر بنایا۔ اب وہ انہی پر لڑتے اور ایک دوسرے کا منہ نوچتے ہیں اور جو شخص اس معرکہ

کارزار سے کامیاب لوٹتا ہے وہی وقت کا علامہ، زمانہ کا فقیہ، اور شہر کا سردار واامام پکارا جاتا ہے۔ شیطان نے ان کو اچھا رستہ دکھایا ہے اور ان سے خوب چال چلی ہے۔ اس نے ان کو سکھایا ہے کہ تمھارے علم کی پونجی تھوڑی ہے جو ضرورت کے لئے کسی طرح کفایت نہیں کرسکتی پس علم کلام کی پناہ پکڑو اور متکلمین کے سلاح خانہ سے ہتھیار مستعار لو تاکہ بحث ومناظرہ کے معرکوں میں کامیاب رہو۔ ابلیس نے ان کے بارہ میں اپنا گمان سچ ثابت کردکھایا اور ان میں سے بہتوں نے اسکی پیروی کرڈالی صرف تھوڑے ہیں جو بچ رہے ہیں۔ افسوس ہے ان لوگوں کی عقلوں پر شیطان ان کو کہاں بہکائے لیے جارہا ہے اور وہ اسکے پیچھے بھاگے چلے جارہے ہیں۔

## چوتھی صدی سے پہلے اور چوتھی صدی کے بعد

اگرچہ فقہ کے یہ تمام اسکول چوتھی صدی سے پہلے ہی قائم ہوچکے تھے لیکن اس وقت تک اندھی تقلید اور گروہ بندی کے وہ تمام فتنے ظہور میں نہیں آئے تھے جو بعد میں ظہور میں آئے۔ چوتھی صدی سے پہلے کے علماء اور عوام دونوں کا طریقہ آج کے علماء اور عوام کے طریقہ سے بالکل مختلف تھا۔ آج ہر مسلمان بچہ ماں کے پیٹ سے حنفی یا اہل حدیث، مقلد یا غیر مقلد پیدا ہوتا ہے اور ان میں سے کسی نہ کسی طریقہ ومسلک کی حمایت کے لئے اپنے اندر مجنونانہ عصبیت رکھتا ہے لیکن اُس عہد میں یہ دستور نہ تھا۔ عوام کو ان مذاہب اور ان طریقوں سے کوئی سروکار نہ تھا۔ اور اُس زمانہ کی مسجدیں ہمارے زمانہ کی مظلوم مسجدوں کی طرح مقلد وغیر مقلد

کی معرکہ آرائیوں اور تکفیر و تفسیق کی گرم بازاریوں سے آلودہ نہیں ہوئی تھیں عوام اپنی دینی ضروریات میں اپنے شہر کے ہر اس عالم سے رجوع کرتے جس کے دین اور تقویٰ پر ان کو اعتماد ہوتا اور اسکے فتووں اور اسکی رایوں پر بغیر کسی خدشہ کے اطمینان کرتے۔ ان کو اس سے کوئی بحث نہیں ہوتی تھی کہ وہ فقہ کے مختلف مذاہب میں سے کس مذہب کا عالم اور مختلف آئمہ میں سے کس امام کی طرف رجحان رکھتا ہے لیکن آج کا حال اس سے بالکل مختلف ہے۔ آج ہر جماعت کے الگ الگ علماء اور الگ الگ مفتی ہیں اور ممکن نہیں ہے کہ ایک مقلد، غیر مقلد سے اور ایک غیر مقلد کسی مقلد سے فتویٰ پوچھ کر اپنے دین کو سلامت رکھ سکے۔ یہاں تک کہ مسجدوں میں ان میں سے ایک کے پیچھے دوسرے کی بسا اوقات نماز بھی درست نہیں ہوتی ہے پہلی اور دوسری صدی کے مسلمانوں کا ان معاملات میں جو حال تھا اس کے متعلق ابوطالب مکی صاحب قوت القلوب کی شہادت یہ ہے جو ہم شاہ صاحب کے واسطے سے پیش کرتے ہیں:-

"یہ کتابیں اور مجموعے سب بعد کی چیزیں ہیں۔ اشخاص کے قیل و قال پر تکیہ کر لینا، کسی ایک ہی متعین مذہب پر فتویٰ دینا، ہر بات میں کسی ایک ہی شخص کے قول کی نقل و حکایت کرنا اور اسی کے مذہب پر تخریج کرنا بعد کی چیز ہے۔ پہلی اور دوسری صدی کے لوگ ان باتوں سے آشنا نہ تھے۔"

اسکے بعد شاہ ولی اللہ صاحبؒ خود اپنی تحقیق میں یہ بیان فرماتے ہیں کہ یہی حال چوتھی صدی تک باقی رہا۔ خود ان کے الفاظ یہ ہیں:-

"پہلی دو صدیوں کے بعد اگرچہ تخریج کی رسم کچھ چل پڑی تھی لیکن تحقیق سے یہی
پتہ چلتا ہے کہ چوتھی صدی تک کے لوگ کسی ایک ہی متعین مذہب کی تقلید،
اسی کے اصولوں کے مطابق تخریج اور اسی کی نقل و حکایت پر جمے نہیں تھے۔
ان میں دونوں طرح کے لوگ تھے۔ علماء بھی اور عوام بھی۔ عوام کا حال یہ تھا کہ
وہ تمام متفق علیہ مسایل میں، جن میں مسلمان یا کم از کم جمہور مجتہدین مختلف نہ
تھے، براہ راست صاحب شرع کی پیروی کرتے تھے اور غسل، وضو، نماز اور
زکوٰۃ کے تمام احکام و آداب اپنے گھر کے بزرگوں اور اپنے شہر کے معلموں سے
سیکھتے تھے اور ان پر عمل کرتے تھے۔ اور جب کوئی خاص صورت پیش آجاتی
تو بغیر کسی امتیاز مذہب و مسلک کے جس مفتی و فقیہ سے بھی ممکن ہوتا فتویٰ پوچھ
لیتے"۔

شاہ صاحب نے اپنے اس دعوے کے ثبوت میں ابن ہمام کی مندرجہ ذیل شہادت بھی پیش
کی ہے:۔

"کبھی ایک سے پوچھ لیتے کبھی دوسرے سے۔ کسی متعین مفتی کے پابند نہ تھے"۔

**علماء کا حال**

اس عہد کے علماء کا حال بھی بعد کے علماء کے حال سے بالکل مختلف تھا۔ اس زمانہ
میں دو قسم کے علماء تھے۔

ایک وہ جو مجتہد مطلق کی شان رکھتے تھے۔ وہ دین کے معاملہ میں جو کچھ کہتے اپنے علم و
بصیرت کی روشنی میں کتاب سنت کی کسوٹی پر جانچ کر کہتے۔ یہ نہیں تھا کہ اگلوں نے جو کچھ کہہ دیا

جو اس کو آنکھ بند کر کے قبول کر لیں اور جب ضرورت پیش آئے بے جھجک اسکو نقل کرتے ہیں۔ قاضی ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ دونوں حضرات امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد ہیں لیکن یہ نہیں ہے کہ وہ امام صاحب کے اجتہادات سے اختلاف نہ کرتے ہوں۔ ان حضرات کے اختلافات کا حال یہ ہے کہ اگر وہ سب جمع کر لئے جائیں تو امام صاحب کی فقہ سے ان کی فقہ بالکل الگ مرتب کی جا سکتی ہے۔ لیکن چونکہ ان کے اجتہاد کے بنیادی اصول وہی ہیں جو ابراہیم نخعیؒ اور امام ابو حنیفہ صاحبؒ نے قائم کئے تھے اسلئے یہ لوگ فقہ حنفی کے عمائد میں سے گنے گئے اور امام ابو حنیفہ صاحبؒ سے اختلاف کے باوجود آج تک ان کو حنفیت سے خارج کرنے کی جرأت کوئی نہ کر سکا۔

دوسرے وہ علماء تھے جو اجتہاد کے تمام شرائط اپنے اندر نہیں جمع کر سکے تھے۔ یہ لوگ بیشتر کسی خاص امام کے مسائل و اجتہادات کو اپنے پیش نظر رکھتے تھے لیکن اس پیش نظر رکھنے کی صورت ہرگز وہ نہیں تھی جو آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ چند مخصوص کتابوں میں جو کچھ لکھا ہوا ہے بغیر کسی بحث و تنقید کے مجموعہ وحی و الہام بن گیا ہے۔ بلکہ یہ لوگ ان مسائل کو اپنے فکر و نظر کی کسوٹی پر جانچتے پرکھتے تھے۔ ان کو تفصیلی دلائل کی روشنی میں سمجھتے تھے۔ اور پھر ان کے ضعیف و قوی میں فرق کر کے قوی کو ترجیح دیتے تھے اور ضعیف کو مرجوح قرار دیتے تھے۔ بسا اوقات اپنے آئمہ کے اقوال و مذاہب پر استدراک کر کے خود اپنا اجتہاد بھی پیش کرتے تھے اور ان باتوں کے باوجود نہ تو یہ سمجھا جاتا تھا کہ ان کے دین میں کوئی فتور واقع ہو گیا ہے اور نہ ان کو ان کے اماموں کی پیروی ہی سے خارج سمجھا جاتا تھا۔ شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ ان ساری

باتوں کا ذکر ان الفاظ میں فرماتے ہیں:۔

"رہے خواص تو ان میں سے اہل حدیث کا حال یہ تھا کہ وہ صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث اور صحابہؓ کے آثار میں مشغول رہتے تھے ....... اور اگر حدیثوں کے تعارض یا ترجیح کے پہلو کے مخفی ہونے کے سبب سے کسی مسئلہ میں کوئی قابل اطمینان بات نہ ملتی تو فقہا میں سے کسی کا مسلک اختیار کر لیتے تھے اور اگر اس بارہ میں فقہا کے اقوال بھی مختلف ہوتے تو جو بات زیادہ مضبوط ہوتی اسکو اختیار کر لیتے خواہ وہ اہل مدینہ کی طرف منسوب ہو یا اہل کوفہ کی طرف .........."

اہل تخریج کا حال یہ تھا کہ وہ جس مسئلہ میں کوئی واضح بات نہ پاتے اسکے بارہ میں اپنے مذہب کے اصولوں کی روشنی میں اجتہاد کرتے اور یہ لوگ اپنے اصحاب کے مذہب کی طرف منسوب کئے جاتے۔ کہ فلاں شافعی ہے اور فلاں حنفی ہے۔ اور اصحاب حدیث میں سے بھی جو لوگ مذاہب فقہ میں سے کسی خاص مذہب سے زیادہ موافقت کرتے وہ بسا اوقات اس مذہب کی طرف منسوب کر دیئے جاتے مثلاً نسائی اور بیہقی امام شافعیؒ کی طرف منسوب ہیں۔"

اس سے معلوم ہوا کہ اس زمانہ میں نہ تو اس طرح کے مقلد پائے ہی جاتے تھے جس طرح کہ آج پائے جاتے ہیں اور نہ نرے مقلدین کے لئے افتاء و قضاء کے شعبہ میں کوئی گنجائش ہی تھی۔ اس فرض کو یا تو وہ لوگ انجام دیتے تھے جو مجتہد مطلق کا درجہ رکھتے تھے یا کم سے کم

وہ لوگ جو مجتہد فی المذہب کی حیثیت رکھتے۔ اس سے کم درجہ کے اشخاص کو اس زمانہ میں یہ حق حاصل نہیں تھا کہ وہ دین کے معاملہ میں زبان کھولیں اور فتوی و قضا کے منصب کے آرزو مند ہوں۔

**چوتھی صدی کے بعد**

لیکن آہستہ آہستہ حالات بدل گئے۔ اور ان علماء کی جگہ ایسے علماء وجود میں آئے جنہوں نے مذہبی پیشوائی اور دنیوی عزت کے لالچ میں فقہی مناظرات کو ایک فن کی طرح مرتب کر دیا جس کا لازمی نتیجہ بالآخر یہ نکلا کہ اجتہاد ہر گوشہ سے غائب ہو گیا اور اسکی جگہ تقلید جامد نے لے لی اور علماء اور عوام سب الگ الگ ٹولیوں میں بٹ گئے۔ شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس حالت کا نقشہ امام غزالی رح کے حوالہ سے ان الفاظ میں کھینچتے ہیں:-

"پھر ان صدیوں کے گذرنے کے بعد ایسے لوگ پیدا ہوئے جنہوں نے اصل شاہراہ کو چھوڑ کر دہنے بائیں کی مختلف پگڈنڈیاں اختیار کر لیں اور علم فقہ سے متعلق ان میں مناظرات کا ایک بازار گرم ہو گیا۔ امام غزالیؒ کے الفاظ میں اسکی تفصیل یہ ہے کہ خلافت راشدہ کے خاتمہ کے بعد منصب خلافت کی باگ ایسے لوگوں کے ہاتھ میں آگئی جنہوں نے اسکو بغیر کسی استحقاق کے پایا تھا اور جن کو فتوی اور احکام دین سے کوئی مس نہیں تھا۔ یہ لوگ مجبور ہوئے کہ فرائض کی انجام دہی میں فقہا سے مدد لیں اور ہر موقع پر ان کو ساتھ ساتھ رکھیں۔ لیکن زمانہ وہ تھا کہ ابھی علماء کی ایک جماعت اپنے پچھلے

رنگ پر باقی تھی اور ان میں جہل اور دنیا طلبی کی برائیاں نہیں پیدا ہوئی تھیں ان لوگوں سے جب سرکاری خدمات قبول کرنے کی خواہش کی جاتی تو یہ لوگ اعراض کرتے۔ لوگوں نے حکام کی طرف سے علمار کی اس عزت افزائی کے باوجود جب ان کے اس اعراض کو دیکھا تو ان کو حصول عزت وجاہ کی یہ سب سے زیادہ کامیاب راہ نظر آئی۔ اور وہ پورے جوش وخروش کے ساتھ علم دین کے حصول کی طرف لپکے نتیجہ یہ ہوا کہ وہی فقہار جو مطلوب ومحبوب تھے تھوڑے ہی دنوں کے اندر اندر آستانہ حکومت کے سائل وطالب بن کے رہ گئے۔ اور سلاطین سے بے نیازی اور بے پروائی کی وجہ سے یا تو معزز اور سر بلند تھے یا پھر ان کی دربارداری اور خوشامد کے سبب سے بے حیثیت اور ذلیل ہو گئے۔ اس سے پہلے ہی کلامی تصنیفات کا آغاز ہو چکا تھا جن میں قیل وقال اور اعتراض وجواب کے تمام نقشے موجود تھے۔ اور یہ بھی اتفاق تھا کہ بہت سے امراء وسلاطین فقہی مناظروں کی گرم بازاری کے بڑے دلدادہ تھے۔ ان چیزوں نے طالب دنیا فقیہوں کو ان کتابوں کی طرف متوجہ کیا اور یہ لوگ امام شافعیؒ اور امام ابوحنیفہؒ کے اختلافی مسائل میں اُلجھے۔ انھوں نے گمان کیا کہ اس طرح وہ حقائق شریعت کے استنباط اور اصول فن کی تحقیق وترتیب میں مصروف ہیں۔ بالآخر انھوں نے اختلافی اور مناظرانہ کتابوں کا انبار لگا دیا اور اب تک اسی کام میں سرگرم ہیں اور اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ

آگے کیا کیا فتنے ظہور میں آنے والے ہیں۔"

فقہا کی اس جنگ و جدل سے قدرتاً تقلید جامد کے فتنہ نے جنم لیا چنانچہ شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:۔

"اس جنگ و جدل کا نتیجہ یہ نکلا کہ بالکل غیر شعوری طور پر ان لوگوں کے دلوں میں تقلید رچ بس گئی۔ کیونکہ فقہا کے آپس کے جنگ و جدل کے سبب سے حالت یہ ہو گئی کہ اگر ایک شخص ایک فتویٰ دیتا تو دوسرا اس کی تردید کی کوشش کرتا اس اور اختلاف کے معرکہ کا فیصلہ اس طرح ہوتا کہ اس امر کے بارہ میں متقدمین میں سے کسی کا قول پیش کیا جائے۔"

ان فقہا کی جنگ و جدل نے جو خوفناک نتائج پیدا کئے اگرچہ وہ کسی کی نظر سے چھپے ہوئے نہیں ہیں لیکن ان کے متعلق شاہ ولی اللہ صاحب رح کے تاثرات نہایت گہرے ہیں اسلئے ہم رسالہ انصاف سے خود انہی کے الفاظ میں ان کو پیش کرتے ہیں۔ اگرچہ اس بات کا افسوس ہے کہ ان کے پُر زور قلم کی ترجمانی اردو میں کسی طرح ممکن نہیں ہے لیکن ایک حد تک ان کے تاثرات کا اندازہ ہو سکیگا۔ وہ فرماتے ہیں:۔

"ان میں سے کچھ ایسے ہوئے جنہوں نے اصول فقہ کو قیل و قال کا اکھاڑا بنایا اور اپنے ہم شربوں کے لئے انھوں نے مناظرہ و مباحثہ کے اصول و قواعد مرتب کئے اور اس میں اعتراض و جواب، اثبات و انکار، تعریف و تقسیم اور اختصار و اطناب کے خوب خوب جوہر دکھائے۔ بعضوں نے اس پر مزید فن

یہ کیا کہ ایسی ایسی مستبعد اور ناممکن الوقوع صورتیں گھڑ گھڑ کے انہوں نے مسئلے وضع کئے کہ کوئی عاقل ان کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔ اور اہل تخریج کے کلام سے ایسے ایسے پہلو اور ایسے ایسے اشارات انھوں نے نکالے جن کا سننا نہ کوئی عالم گوارا کرے گا نہ کوئی جاہل۔ مناظرہ ومباحثہ اور موشگافی کا یہ فتنہ بالکل ہماری تاریخ کے ابتدائی فتنے سے مشابہ ہے جب لوگ ملک وسلطنت کے لئے لڑے تھے۔ اس فتنہ کا نتیجہ ایک مطلق العنان بادشاہی اور اندھی بہری لڑائیوں کی شکل میں ظاہر ہوا تھا۔ اس فتنہ کا نتیجہ جہالت اور گھپلے اور شبہات وشکوک کے ایسے طوفان کی صورت میں برآمد ہوا ہے جس سے نجات کی کوئی راہ نظر نہیں آتی۔ اسی فتنہ کے پیٹ سے ان نسلوں نے جنم لیا ہے جن کی پرورش تقلید جامد کی غذا سے ہوئی ہے اور جن کو حق وباطل میں کوئی امتیاز نہیں ہے۔ آج فقیہ اس یاوہ گو کو کہتے ہیں جس نے فقہاء کے اقوال بے سمجھے بوجھے رٹ لئے ہوں اور جو اپنے حلق کے زور سے ان کو دُہرا سکتا ہو۔ اور محدث وہ کہلاتا ہے جو کچھ حدیثیں، غلط اور صحیح میں امتیاز کئے بغیر اپنے جبڑوں کے زور سے افسانہ گویوں کی طرح سنا سکتا ہو۔"

اس دردناک حالت کا نقشہ شیخ عزالدین بن عبدالسلام نے ان الفاظ میں کھینچا ہے:۔

انتہائی تعجب انگیز بات تو یہ ہے کہ یہ فقہائے مقلدین بعض مرتبہ اپنے اماموں

کے ماخذ کے ضعف سے اچھی طرح واقف ہوتے ہیں اور اس کے سبب سے جو اعتراض ان کے خلاف اٹھایا جاتا ہے اس کا وہ کوئی معقول جواب نہیں دے پاتے لیکن اس کے باوجود وہ اس مسئلہ میں انہی کی پیروی کرتے ہیں اور کتاب سنت اور قیاس صحیح سے جو دلائل ان کے خلاف پیش کئے جاتے ہیں ان کی وہ کوئی پروا نہیں کرتے بلکہ کتاب سنت سے بچنے کے لئے طرح طرح کے حیلے اور مختلف قسم کی دور از کار تاویلیں ڈھونڈھتے ہیں اور اس بات کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا ڈالتے ہیں کہ کسی طرح ان کے مقتدا پر کوئی آنچ نہ آنے پائے۔"

پھر آگے چل کر فرماتے ہیں :-

"ان مروجہ مذاہب اور ان کے مقلد پیروؤں کے ظہور سے پہلے لوگوں کا حال یہ تھا کہ وہ بغیر کسی امتیاز مسلک و مشرب کے علماء سے فتوے پوچھ لیا کرتے تھے۔ لیکن ان مقلدوں کا طریقہ یہ ہے کہ وہ اپنے متعین امام ہی کی پیروی کریں گے خواہ اس کا مسلک دلائل سے کتنا ہی دور ہو۔ گویا وہ خدا کا پیغمبر ہے جس کی پیروی ہر حال میں لازم ہے۔ حالانکہ یہ طریقہ حق سے بالکل ہٹا ہوا ہے اور کوئی عقلمند ایک لمحہ کے لئے بھی اس کو پسند نہیں کر سکتا۔"

### تقلید جامد کے خلاف آئمہ کا فتویٰ

ہمارے ان متاخرین فقہا نے تقلید و جمود کا یہ زور ان مقدس اماموں کی حمایت میں صرف کیا ہے جن میں سے ہر امام نے تقلید کے اس بت کو خود پاش پاش کیا تھا۔

حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی نسبت یہ روایت ہے کہ جب خلیفہ منصور حج کو گیا ہے تو اس نے امام مالکؒ سے کہا کہ آپ نے جو کتاب (موطا) مرتب فرمائی ہے میں چاہتا ہوں کہ اس کی نقلیں لے کر اسکے نسخے مملکت کے تمام شہروں میں بھجوا دوں اور یہ حکم جاری کر دوں کہ فتوی و قضا کے تمام معاملات میں اسی کتاب پر عمل کیا جائے۔ اس کتاب کے علاوہ کسی اور کتاب پر عمل نہ کیا جائے۔ امام مالکؒ نے جواب دیا کہ امیر المومنین ایسا نہ کیجئے۔ لوگوں کے پاس بہت سے اقوال و آثار پہنچ چکے ہیں اور جو چیزیں لوگوں کو پہلے سے پہنچ چکی ہیں انہی کو لوگوں نے اپنے عمل کے لئے اختیار کر لیا ہے۔ اس لئے بہتر ہے کہ لوگوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیجئے۔ ان کی آزادیٔ انتخاب میں کوئی مداخلت نہ کیجئے۔

یہی قصہ کسی قدر اختلاف کے ساتھ ہارون الرشید کی طرف منسوب ہے کہ اس نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے مشورہ کیا کہ آپ اجازت دیں تو موطا کو خانہ کعبہ میں آویزاں کر دوں اور مملکت میں حکم جاری کر دوں کہ ہر جگہ یہی کتاب فتوی اور قضا کی بنا قرار پائے لیکن امام مالکؒ نے فرمایا کہ امیر المومنین ایسا نہ کیجئے۔ رسول اللہ صلعم کے صحابہ جزئیات شریعت میں مختلف رائیں رکھتے تھے اور وہ ہر جگہ پہنچے ہیں اور ان کے طریقے ہر جگہ پھیل چکے ہیں۔

اس سے اچھی طرح اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ امام مالکؒ اس بات کو کس قدر پسند فرماتے تھے کہ لوگ اپنی فہم و بصیرت کی روشنی میں کتاب و سنت پر چلیں اور ان کی تحقیق و تنقید میں جو بات ان کو کتاب و سنت سے موافق نظر آئے اسکو اختیار کریں۔ کوئی چیز خواہ مخواہ کو ان کے اوپر ٹھونسی نہ جائے۔ وہ دوسروں کے مسلک و مذہب کو جس نگاہ سے دیکھتے تھے

اس کا بھی اس سے اندازہ ہو جاتا ہے۔ امام مالکؒ سے بڑھ کر اس بات کے لئے کون دردمند ہو سکتا ہے کہ مسلمان کسی غلط راستہ پر نہ چلیں۔ اگر بخدا نخواستہ وہ اپنے مسلک کے سوا دوسروں کے مسلک کو آج کل کے علما کی طرح غلط سمجھتے ہوتے تو یقیناً وہ ہارون الرشید کی خواہش میں مانع نہ ہوتے بلکہ جس دن اس نے ان کے سامنے اپنی یہ خواہش پیش کی تھی اس دن کو اپنی اور اپنے مذہب کی بلند اقبالی کا سب سے بڑا دن سمجھتے۔

آج کل کے علما، اپنے اپنے اماموں کے اقوال کو بالکل بے خطا اور تنقید سے بالاتر سمجھتے ہیں لیکن امام مالک صاحب، جو خود ایک بہت بڑی فقہ کے بانی اور ایک بہت بڑے فقہی مذہب کے امام ہیں، فرماتے ہیں کہ۔

ما من احد الا هو ماخوذ من کلامه ومردود علیه الا رسول الله

رسول اللہ کے سوا ہر شخص کے کلام میں قابل اخذ اور قابل ترک دونوں ہی طرح کی باتیں ہیں۔

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے کتنے معتقدین ہیں جو تصور بھی نہیں کر سکتے کہ ان کی فرمائی ہوئی کسی بات پر انگلی رکھنے کی کوئی گنجائش ہو سکتی ہے لیکن وہ خود یہ فرماتے ہیں کہ جب تک ان کی بات کو کتاب و سنت کی کسوٹی پر اچھی طرح پرکھ نہ لیا جائے اس وقت تک اس کے مطابق فتویٰ نہ دیا جائے۔ الیواقیت والجواہر میں ان کا یہ قول نقل ہوا ہے۔

لا ینبغی لمن لم یعرف دلیلی ان یفتی بکلامی

جو شخص یہ نہ معلوم کر سکے کہ ایک بات میں نے کتاب و سنت کی کس دلیل کی بنا پر کہی ہے وہ میرے قول پر فتویٰ نہ دے۔

فقہ حنفی کے دوسرے اکابر قاضی ابو یوسفؒ اور امام زفر وغیرہ فرمایا کرتے تھے کہ۔

| | |
|---|---|
| لا یحل لاحد ان یفتی بقولنا ما لم یعلم من این قلنا | یہ بات کسی کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ ہمارے قول پر فتوی دے جب تک اسے یہ نہ معلوم ہو کہ وہ بات ہم نے کہاں سے کہی ہے۔ |

عصام بن یوسف سے پوچھا گیا کہ اس کا کیا سبب ہے کہ آپ بہت سی باتوں میں امام ابو حنیفہ صاحب سے اختلاف کر جایا کرتے ہیں۔ انہوں نے جواب دیا کہ اللہ تعالیٰ نے امام صاحب کو فہم و فراست میں سے وہ حصہ عطا فرمایا ہے جو ہم کو نہیں نصیب ہوا ہے۔ اس لئے وہ ایسی باتوں تک پہنچ جاتے ہیں جن تک ہم نہیں پہنچ پاتے۔ اور یہ ہمارے لئے ممکن نہیں ہے کہ ہم ان کے کسی قول پر بے سمجھے بوجھے فتوے دے دیں۔

امام شافعیؒ کے متعلق روایت ہے کہ انھوں نے نہ تو اپنی تقلید کی کسی کو اجازت دی ہے اور نہ کسی دوسرے کی تقلید کی اجازت دی ہے۔ مزنی نے اپنے مختصر کے شروع میں نہایت تصریح کے ساتھ اس کا حوالہ دیا ہے۔ یہ انہی کا ارشاد ہے کہ :۔

| | |
|---|---|
| مھما قلت من قول او اصلت من اصل فبلغ عن رسول اللہ خلاف ما قلت فالقول ما قالہ صلی اللہ علیہ وسلم | میں جو بات بھی کہوں اور جو اصول بھی ٹھہراؤں جب اس کے خلاف کوئی بات رسول اللہ سے مل جائے تو پھر حضور ہی کی بات اصل ہے۔ |

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا یہ ارشاد ہے :۔

لیس لاحد مع اللہ ورسولہ کلام۔ — اللہ اور رسول کی بات کے ہوتے ہوئے کسی کی بات کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے۔

## ائمہ کی ایک دوسرے کے ساتھ رواداری

چونکہ یہ حضرات حق کو اپنے ہی اقوال کے اندر محدود نہیں سمجھتے تھے اس لئے اپنے مسلک پر قائم رہتے ہوئے یہ دوسروں کو بھی عزت و احترام کی نگاہوں سے دیکھتے تھے اور ان کے مسلک و مذہب کی قدر کرتے تھے۔ آج کتنے حنفی اور اہل حدیث ہیں جو ایک دوسرے کے پیچھے نمازیں پڑھنا جائز نہیں سمجھتے ہیں لیکن ان بزرگ ائمہ کا طریقہ اس کے بالکل خلاف تھا۔ امام ابو حنیفہ اور امام شافعی کے اصحاب برابر مدینہ کے مالکی ائمہ کے پیچھے نمازیں پڑھتے تھے حالانکہ یہ لوگ بسم اللہ نہ تو سراً پڑھتے تھے نہ جہراً۔ رشید نے امام مالک کے فتوی پر فصد کے بعد وضو کے بغیر نماز پڑھائی، قاضی ابو یوسف نے اسکے پیچھے نماز پڑھلی اور دہرائی نہیں۔ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نکسیر ٹوٹنے اور جسم سے خون نکلوانے کی صورت میں وضو کے قائل تھے۔ ان سے سوال کیا گیا کہ اگر امام کے جسم سے خون نکل آئے اور وہ وضو نہ کرے تو کیا آپ اسکے پیچھے نماز پڑھیں گے؟ انہوں نے فرمایا بھلا امام مالک اور سعید بن مسیب جیسے لوگوں کے پیچھے نماز پڑھنے سے کس طرح انکار کر سکتا ہوں۔ قاضی ابو یوسف اور امام محمد کے متعلق روایت ہے کہ یہ لوگ عیدین میں تکبیر ابن عباس کے مذہب کے مطابق کہتے تھے اس لئے کہ ہارون الرشید کو اپنے جد امجد کی تکبیر زیادہ پسند تھی اور وہ ان کے پیچھے نماز پڑھا کرتا تھا۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مرتبہ صبح کی نماز امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مقبرہ کے قریب

پڑھی اور اس دن امام صاحب کے احترام میں دعائے قنوت نہیں پڑھی اور فرمایا کہ ہم کبھی کبھی اہل عراق کے مذہب کو
بھی اختیار کر لیتے ہیں۔ قاضی ابو یوسف رح کے متعلق روایت ہے کہ ایک مرتبہ انھوں نے حمام میں غسل کر کے
جمعہ کی نماز پڑھائی جب لوگ متفرق ہو چکے تو پتہ لگا کہ حمام کے کنوئیں میں چوہیا مری ہے۔ ان سے ذکر کیا گیا
تو فرمایا کچھ مضائقہ نہیں آج ہمارا عمل اہل مدینہ کے مذہب پر ہوگا۔ اذا بلغ الماء قلتین لم یحمل خبثا۔

## اختلاف کے نقطے

یوں ظاہری حالات پر نظر ڈالیے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے مختلف فقہی گروہوں میں صرف اختلاف ہی اختلاف ہے، اتفاق کا کوئی
نقطہ سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔ لیکن پچھلی فصلوں میں جو تفصیلات ہم نے پیش کی ہیں
ان کو جو شخص بھی غور سے پڑھیگا اس پر یہ حقیقت واضح ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی کہ جہاں تک
اصولوں کا تعلق ہے ہماری فقہ کے مختلف مذاہب میں سرے سے کوئی اختلاف ہے ہی
نہیں۔ دین کی جو اساسات ایک کے نزدیک معتبر ہیں وہی دوسرے کے نزدیک معتبر ہیں۔
مواد اجتہاد کی ترتیب میں جو تقدیم و تاخیر ایک کے نزدیک قابل لحاظ ہے وہی تقدیم و تاخیر دوسروں
کے نزدیک بھی قابل لحاظ ہے۔ اس سے کسی کو بھی اختلاف نہیں ہے کہ شریعت کا اصلی ماخذ
اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت ہی ہے اور جن معاملات میں ان کی رہنمائی موجود
ہو ان معاملات میں قیاس اور تخریج کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اس حقیقت سے
بھی کسی کو انکار نہیں ہے کہ اگر کسی امر میں قیاس شرعی کو استعمال کیا جائے اور بعد میں اسکے
بارہ میں پیغمبر کی کوئی معتبر حدیث سامنے آجائے تو قیاس کی جگہ آپ سے آپ حدیث کو مل

جائے گی۔ اس امر پر بھی سب اتفاق رکھتے ہیں کہ دین کے معاملہ میں کسی شخص کی بات، خواہ وہ کتنا ہی بڑا شخص کیوں نہ ہو، اس وقت تک کوئی وزن نہیں رکھتی ہے جب تک اس کی بنیاد کسی شرعی دلیل پر نہ قائم ہو۔ اس حقیقت سے بھی کسی کو اختلاف نہیں ہے کہ اپنے اپنے دیار کے علماء کی طرف ایک قسم کا خصوصی رجحان محض ایک جذباتی چیز ہے جو ایک خاص حد ہی تک جائز ہے۔ اس حد سے آگے دین میں اسکی کوئی جگہ نہیں ہے۔

یہ ساری باتیں ہر گروہ کے نزدیک مسلم ہیں۔ پھر غور کرنا چاہیئے کہ وہ نقطے کیا ہیں جو ان کے درمیان اختلاف کا سبب بنتے ہیں اور جن کے سبب سے ملت میں پھوٹ پڑی ہے۔ اور ان کا تجزیہ کر کے دیکھنا چاہیئے کہ کیا وہ امور فی الحقیقت ایسی شرعی اہمیت رکھتے ہیں کہ ان کو ہمیشہ ہمیش باقی رکھنے کی ضرورت ہے یا وہ نظر انداز کر دیئے جانے کے لائق ہیں

۱۔ سب سے پہلی چیز جو اختلاف کا سبب بنی ہے وہ اپنے اپنے دیار کے علماء کو ترجیح دینے کا رجحان ہے۔ سعید بن مسیب نے اہل مدینہ کو ترجیح دی اور ابراہیم نخعی نے اہل کوفہ کو ترجیح دی۔ یہی رجحان بعد کے زمانوں میں آہستہ آہستہ ترقی پاتا رہا۔ ابتداً اس رجحان کا نتیجہ صرف یہ نکلا کہ جن معاملات میں لوگوں نے صحابہ کی رائیں مختلف پائیں ان میں اپنے اپنے دیار کے علماء کی رایوں پر اعتماد کیا اور ان کو ترجیح دی۔ اس حد تک اس میں کوئی خاص قباحت نہیں تھی۔ لیکن بعد میں اس رجحان نے اپنے فطری حدود سے تجاوز کر کے ایک شہری یا صوبائی تعصب کی سی صورت اختیار کر لی اور اس کے اثر سے لوگوں کے سوچنے کا انداز بدل گیا۔ لوگ بجائے اس کے کہ ایک مسئلہ پر غور کرتے ہوئے نفس دلائل کے ضعف و قوت پر نگاہ جماتے اور ان کو

ان کے اوصاف کے لحاظ سے جانچتے، یہ دیکھنے لگے کہ ان کے شہر اور ان کے دیار کے لوگ اس معاملہ میں کیا رائے رکھتے ہیں۔ یہاں تک کہ یہ تعصب اس حد تک بڑھ گیا کہ بسا اوقات کسی خاص دیار کے لوگوں نے بعض صحیح حدیثوں کو محض اس وجہ سے نہیں قبول کیا کہ وہ حدیثیں ان کے دیار کے علماء میں شہرت نہ پا سکی تھیں۔

ایک زمانہ میں کوفہ اور مدینہ کے درمیان کا فاصلہ بھی ایک فاصلہ تھا۔ ایک جگہ کے لوگ دوسری جگہ کے لوگوں سے نہ تو اچھی طرح واقف ہی ہو سکتے تھے اور نہ ایک دوسرے کے علم سے اچھی طرح فائدہ ہی اٹھا سکتے تھے۔ نیز اس زمانہ میں نہ تو پیغمبر کی ساری حدیثیں ہی ظہور میں آکر مرتب ہو سکی تھیں اور نہ صحابہ و تابعین کے اقوال و آثار ہی مرتب حالت میں موجود تھے۔ اس لئے اس زمانہ میں اگر اپنے اپنے دیار کے علماء کے علم پر لوگوں نے زیادہ اعتماد کیا تو اسکے لئے ایک وجہ جواز موجود تھی۔ لیکن اس زمانہ میں ہمارے لئے کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہم اپنے دین پر غور کرتے ہوئے مدینہ اور کوفہ میں کوئی فرق کریں۔ ہمارے سامنے عبداللہ بن عمرؓ اور عبداللہ بن مسعودؓ دونوں کا علم مرتب حالت میں موجود ہے۔ ہم ابراہیم نخعیؒ اور سعید بن مسیبؒ دونوں کے دلائل کو ایک ساتھ وزن کرنے کے ذرائع اپنے قبضہ میں رکھتے ہیں۔ پھر ہمارے پاس حدیثوں کا ذخیرہ بھی مرتب صورت میں موجود ہے جس کے اندر وہ حدیثیں بھی شامل ہیں جو پہلے طبقہ میں ظہور میں آئیں اور وہ حدیثیں بھی ہیں جو دوسرے اور تیسرے طبقہ میں ظاہر ہوئی ہیں۔ اس لئے ہم نہایت آسانی کے ساتھ ہر ایک کے دلائل کو ہر قسم کے مقامی تعصبات سے آزاد ہو کر جانچ پرکھ سکتے ہیں اور ان میں سے جس کو کتاب و سنت سے قریب تر پائیں اسکو اختیار کر سکتے ہیں۔

۲۔ دوسری چیز جو اختلاف کا سبب ہوئی ہے وہ تخریج اور روایات کی جنگ ہے۔ فقہا کے گروہ نے تخریج کو اہمیت دی اور اس اہمیت دینے میں وہ اس قدر آگے نکل گئے کہ بسا اوقات انھوں نے صحیح روایات کو بھی نظر انداز کر دیا۔ اسکے برعکس حضرات اہل حدیث نے روایات کو اہمیت دی اور اس اہمیت دینے میں وہ اس قدر آگے نکل گئے کہ نہ صرف تخریج کی ضرورت کے منکر ہو گئے بلکہ انھوں نے روایات کو ان کے اصلی حق سے کہیں زیادہ وزن دے دیا۔

اس نزاع کی نوعیت کا کسی قدر اندازہ اس اختلاف سے ہو سکیگا جو خبر احاد کے حجت ہونے کے بارہ میں فقہا اور اہل حدیث میں ہے۔ شافعیہ اور اہل حدیث حضرات خبر احاد کے حجت ہونے پر اس قدر زور دیتے ہیں کہ ان کے مقابل میں بسا اوقات وہ سارے تمام پہلوؤں کو نظر انداز کر جاتے ہیں۔ اسکے برعکس مالکیہ اور احناف بعض صورتوں میں خبر احاد کی سرے سے کوئی پروا ہی نہیں کرتے جن معاملات کا تعلق عام لوگوں کی زندگی سے ہو ان کے بارہ میں حنفیہ بسا اوقات ایک قیاس کو ترجیح دے دینگے اور خبر احاد کو یہ کہہ کے نظر انداز کر دیں گے کہ کیا معلوم راوی نے بات کو ٹھیک سمجھا بھی ہے یا نہیں، وہ اس کو یاد بھی رکھ سکا ہے یا نہیں، اور اس کو ٹھیک سے ادا بھی کر سکا ہے یا نہیں۔ ان کے نزدیک جس معاملہ کا تعلق عام لوگوں کی زندگی سے ہے اسکے بارہ میں روایت بھی متعدد طریقوں سے ہونی چاہیئے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو وہ اس روایت کی آنحضرت صلعم کی طرف نسبت کو کچھ بہت زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ اسی طرح مالکیہ جہاں خبر احاد کو اہل مدینہ کے عمل کے خلاف پاتے ہیں وہاں اس کو کوئی خاص اہمیت نہیں دیتے۔ وہ کہتے ہیں کہ مدینہ تمام خبر و روایت کا مرکز اور تمام جلیل القدر صحابہ کا مستقر رہا ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ

وہاں کے لوگ کسی ایسے طریقہ پر مجتمع ہو جائیں جو سنت نبوی کے خلاف ہو۔ اس لئے اگر کوئی روایت ان کے عمل کے خلاف وارد ہوئی ہے تو وہ روایت قابل بحث ہے نہ کہ اہل مدینہ کا عمل۔

مالکیہ اور حنفیہ کے اس رویہ پر اہل حدیث حضرات کو بڑا اعتراض رہا ہے اور اس کے سبب سے انھوں نے ان پر سنت سے اعراض کرنے کا الزام لگایا ہے۔ حالانکہ یہ زیادتی ہے۔ کسی چیز کے سنت بن جانے کے لئے تنہا یہی بات کافی نہیں ہے کہ اسکو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر دیا جائے۔ بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ معاملہ کی نوعیت کے لحاظ سے اس نسبت پر اعتماد بھی کیا جا سکے۔ علم ضرورت کے معاملات میں حنفیہ جو خبر احاد کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے یا مالکیہ عمل اہل مدینہ کے بالمقابل خبر احاد کی زیادہ پروا نہیں کرتے تو خدا نخواستہ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ وہ سنت نبوی سے بے پروائی برتنا چاہتے ہیں بلکہ ان کا نقطہ نظر یہ ہے کہ ان حالات میں کتاب و سنت سے قریب تر بات معلوم کرنے کا محتاط طریقہ وہی ہے جو انھوں نے اختیار کیا ہے نہ کہ وہ جو اہل حدیث حضرات نے اختیار کیا ہے۔ ان کے اس نقطہ نظر پر علمی حیثیت سے بحث کی جا سکتی ہے اور اس سے اختلاف بھی کیا جا سکتا ہے لیکن یہ کہنا کہ ایسا کر کے انھوں نے سنت سے اعراض کیا ہے کسی طرح صحیح نہیں ہے۔ ان کا دعویٰ یہ ہے کہ انھوں نے ایسا اسلئے کیا ہے کہ کسی چیز کے سنت بنانے کے لئے جس احتیاط کا دین میں مطالبہ کیا گیا ہے اسکے معاملہ میں وہ سہل انگاری کے مجرم نہ قرار پائیں۔ اور اس دعویٰ پر وہ جو دلیلیں دیتے ہیں وہ کافی وزن رکھتی ہیں۔

تاہم اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ فقہائے کرام اپنے قرار دادہ اصولوں کی پاسداری میں بسا اوقات اس بیدردی سے روایات کی تردید کرتے ہیں کہ آدمی کے لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ ان لوگوں کے اندر زیادہ حمیت اپنے اصولوں کے لئے ہے یا رسول اللہ کی احادیث کے لئے۔ خبر احاد کو ان کی اصلی حیثیت سے بڑھانا یقیناً ایک زیادتی ہے لیکن اس سے بڑی زیادتی یہ ہے کہ اپنے اجتہادات و قیاسات کو بچانے کی خاطر روایات سے بے پروائی برتی جائے اور ان کے ساتھ عام اقوال کا سا سلوک کیا جائے۔ اس چیز کے سبب سے قدرتی طور پر فقہا اور اہل حدیث کے درمیان خلیج اختلاف وسیع ہوئی ہے اور یہ اس وقت تک برابر بڑھتی ہی رہے گی جب تک دونوں گروہ اپنے اپنے نقطہ نظر میں تبدیلی نہیں کرینگے۔ فقہا اس بات پر آمادہ نہیں ہونگے کہ جو روایات دوسرے قرائن و قیاسات اور کتاب و سنت کے عام مزاج سے موافق نظر آئیں ان کے بالمقابل اپنے اجتہادات و تخریجات کو وزن نہ دیں گے۔ اور اہل حدیث اس بات پر آمادہ نہیں ہوں گے کہ خبر احاد میں جو پہلو ضعف کے موجود ہیں ان کا اعتراف کرینگے اور ان سے قوی تر چیزوں کے بالمقابل ان کو ترجیح دینے پر زور نہیں دینگے۔ اس طرح دونوں گروہ جب ایک نقطہ اعتدال پر جمع ہو جائیں گے تو ایک بڑا سبب اختلاف آپ سے آپ رفع ہو جائے گا۔

۳۔ تیسرا بڑا سبب اختلاف کا کسی ایک ہی متعین امام کی تقلید اور تنہا اسی کے اجتہادات و اقوال کی پیروی ہے۔ الگ الگ اماموں کے مقلدین و متبعین لازماً ایک دوسرے سے الگ الگ ہی رہیں گے۔ اور یہ علیحدگی اس صورت میں اور بھی زیادہ ہو جائے گی جب

ان میں سے ہر ایک حق و ہدایت کو اپنے ہی امام اور اس کے منتسبین کے اندر محصور مانتا ہو۔ یہ چیز تقلید شخصی کا ایک لازمی خاصہ ہے جس سے مقلد کے لئے بچنا تقریباً محال ہے۔

اسلام نے رسول اللہ کے سوا کسی کو بھی یہ درجہ نہیں دیا ہے کہ اسکی ہر بات بلا کسی تنقید کے تسلیم کر لی جائے۔ ہماری شریعت میں ہر صاحب علم پر یہ واجب ہے کہ دین کے معاملات میں وہ اپنی فہم و بصیرت سے کام لے اور اس وقت تک کسی بات کی پیروی نہ کرے جب تک وہ یہ نہ معلوم کر لے کہ جس بات کی وہ پیروی کر رہا ہے وہ خدا کی شریعت کے موافق ہے۔ اگر کوئی شخص خود اتنا علم نہیں رکھتا ہے کہ براہ راست شریعت کی باتیں سمجھ سکے تو اس کا یہ فرض ہے کہ وہ دین کی باتیں ان لوگوں سے معلوم کرے جن کے علم اور تقویٰ پر اس کو پورا پورا اعتماد ہے۔ قطع نظر اس سے کہ وہ کس امام کے پیرو ہیں اور کس گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔

ہمارے دین میں پیدائشی حنفی اور پیدائشی اہل حدیث کیلئے کوئی گنجائش نہیں ہے ہمارے علما کو چاہیئے کہ اس قسم کے تعصبات کو پیدا کرنے اور بڑھانے کے بجائے ان تعصبات کو مٹانے کی کوشش کریں اور عوام کو ان گروہ بندیوں سے اسی طرح آزاد کر دیں جس طرح شاہ ولی اللہ صاحب کے بیان کے مطابق چوتھی صدی سے پہلے تک کے مسلمان ان گروہ بندیوں سے آزاد تھے۔ ان کو اس بات کا خوگر کیا جائے کہ وہ گروہوں کی عزت کرنے کے بجائے صرف علم و تقویٰ کی عزت کریں اور اپنے دین کے معاملہ میں ہر اس شخص کی طرف رجوع کریں جس کو عالم اور خدا ترس پائیں۔ عام ذہنی تبدیلی پیدا کرنے کے لئے یہ تدبیر اختیار کی جائے کہ دینی مدارس میں کسی ایک ہی متعین امام کی فقہ کی تعلیم دینے کے بجائے پوری اسلامی فقہ کی تعلیم دی جائے تاکہ طلبہ

میں وسعت نظر پیدا ہو، اور ایسے علما نکلیں جو گروہ بندیوں سے آزاد ہو کر پوری فقہ اسلامی کو اپنا ورثہ سمجھیں اور اس کے اندر جو کتاب و سنت سے قریب تر ہے بلا کسی تعصب کے اس پر خود بھی عمل کریں اور دوسروں کے سامنے بھی اسی کو عمل کے لئے پیش کریں۔

۴۔ چوتھی چیز جو امت میں بہت سے فقہی جھگڑوں کا سبب بنی ہے وہ اجتہادی امور میں، رواداری اور وسعت قلب کے بجائے لوگوں کا بیجا تعصب اور تشدد ہے۔ اجتہاد خواہ کتنے ہی بڑے آدمی کا ہو، غلطی اور صحت دونوں ہی باتوں کا احتمال رکھتا ہے۔ اس وجہ سے ایک مجتہد اگرچہ اپنی ذات کی حد تک اپنے اجتہاد کا پابند ہوتا ہے لیکن وہ دوسروں پر نہ اسکو واجب کر سکتا ہے اور نہ دوسروں کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اسکے اجتہاد کو نصوص کا درجہ دے کر اسکی بنا پر دوسروں سے لڑنا جھگڑنا شروع کر دیں۔ ایک شخص اگر رفع یدین کو ضروری سمجھتا ہے تو شوق سے کرے لیکن اس کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ دوسروں سے اسکے لئے لڑنا شروع کر دے اور نہ دوسروں کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ لٹھ لے کر کسی رفع یدین کرنے والے کے پیچھے پڑ جائیں۔ پچھلی فصلوں میں ہم اجتہادی امور میں ائمہ کی رواداری کی متعدد مثالیں نقل کر چکے ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف اپنے اجتہاد کے خلاف دوسروں کے اجتہاد کو وزن دیتے تھے بلکہ بعض اوقات اپنے اجتہاد کو چھوڑ کر دوسروں کے اجتہاد پر عمل بھی کر لیتے تھے۔ تعصب اور تشدد کا اصلی سبب درحقیقت جہالت ہے۔ اول تو اس زمانہ میں فقہ کی تعلیم عام طور پر گروہی عصبیت کے تحت ہوتی ہے اس وجہ سے ایک گروہ کے علما کو دوسروں کے دلائل سے واقف ہونے کا کوئی موقع ہی نہیں ملتا۔ ثانیاً ہر گروہ

کے لوگ بالعموم صرف اپنے گروہ کے مسائل ہی سے واقف ہوتے ہیں ان کے دلائل تک ان کی رسائی نہیں ہو پاتی ہے۔ اس وجہ سے وہ ان کا درجہ ان کی حیثیت سے زیادہ قرار دے دیتے ہیں۔ اگر ان کو دوسروں کے اجتہادات اور ان کے دلائل سے بھی واقفیت ہو تو یہ چیز لازماً ان کے ذہن کو متوازن بنانے میں مددگار رہے گی اور اگر وہ زیادہ نہیں صرف اپنے ہی مسائل کی دلیلوں پر نظر رکھتے ہوں گے تو اتنا تو سمجھ ہی سکیں گے کہ جس بات کو وہ اس درجہ اہمیت دے رہے ہیں دین کے اندر اس کا ماخذ کیا ہے اور اس ماخذ کی حیثیت کیا ہے۔

## اسلامی ریاست میں فقہی اختلافات کا حل

اگرچہ ہمارے ملک کے مختلف فقہی مذاہب کے پیرو اسلامی نظام کے مطالبہ پر متفق ہیں، ان میں سے کسی نے بھی خواہ وہ اس ملک کے اندر کتنی ہی اقلیت میں کیوں نہ ہو، فرضی اندیشوں کی بنا پر اس کی مخالفت نہیں کی ہے، بلکہ فقہی گروہوں کے سوا بعض فرقوں نے بھی اس مطالبہ میں سواد اعظم کا ساتھ دیا ہے، تاہم اس بات کا اندیشہ موجود ہے کہ اسلامی نظام کے مخالفین اپنی ریشہ دوانیوں سے ان میں سے بعض کو بدگمان کرنے کی کوشش کریں۔ اس وجہ سے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ فقہی معاملات میں ایک صحیح اسلامی حکومت کا جو مزاج ہوتا ہے اسکو واضح کر دیا جائے تاکہ ناواقفیت کسی کے لئے بدگمانی کا سبب نہ بن سکے۔ نیز اگر کوئی گروہ کسی غلط توقع کی بنا پر اس کی تائید کر رہا ہو تو وہ اپنی اس غلط فہمی کو وقت سے پہلے رفع کر سکے۔

فقہی معاملات سے متعلق ایک صحیح اسلامی حکومت کا رویہ معین کرنے کے لئے

دو بنیادی باتوں کا سامنے رکھنا ضروری ہے :-

۱- ایک یہ کہ ایک اسلامی ریاست ایمان کی تمام جزئیات اور عقائد و اعمال کی تمام تفصیلات سے تعرض نہیں کیا کرتی ہے۔ اس کا تعلق صرف اسلام یعنی ان ظاہری اعمال و عقائد تک محدود ہوتا ہے۔ جو اجتماعی و معاشرتی اور سیاسی زندگی سے لگاؤ رکھنے والے ہوتے ہیں۔ اسلام کے بنیادی عقیدہ یعنی توحید و رسالت کا اقرار کرنا مسلمانوں کے طریقہ پر نماز ادا کرنا، اسلامی بیت المال کو زکوٰۃ دیتے رہنا، نکاح و طلاق اور کھانے پینے میں اسلام کے ٹھہرائے ہوئے ضابطہ حلال و حرام کی پابندی کرنا بس ریاست کا براہ راست تعلق اسی طرح کے امور سے ہے۔ اگر ایک شخص ان چیزوں میں اسلامی طریقوں کا پابند ہے تو ایک اسلامی حکومت اس سے اس امر پر کوئی باز پرس نہیں کرے گی کہ وہ فقہی مسائل میں امام مالکؒ یا امام احمدؒ کا پیرو کیوں ہے، امام ابو حنیفہؒ یا امام شافعیؒ کا پیرو کیوں نہیں ہے ؟ یا عقائد میں معتزلہ کا ہمنوا کیوں ہے، اشعری یا ماتریدی کیوں نہیں ہے ؟ یا خانقاہی رجحانات کیوں رکھتا ہے، نہایت کٹر قسم کا ظاہری اور اہل حدیث کیوں نہیں ہے ؟ اس طرح کے امور سے نہ براہ راست ریاست کا تعلق ہوتا ہے نہ ان امور سے اسلام نے ریاست کو تعرض کرنے کی اجازت دی ہے۔ یہ باتیں افراد کے اپنے فیصلہ کرنے کی ہیں۔ اس سلسلہ میں ریاست کا فرض صرف اس قدر ہے کہ افراد کی آزادی رائے اور آزادی انتخاب کی حفاظت کرے کسی کو اس آزادی پر دست درازی کرنے کا کوئی موقع نہ دے۔ اگر حکومت کسی غلط رجحان کی اصلاح کی ضرورت محسوس کرتی ہے تو اس کے لئے تعلیمی و تبلیغی ذرائع استعمال کر سکتی

بے بنا نون کی طاقت نہیں استعمال کر سکتی تاکہ لوگ جو تبدیلی قبول کریں وہ اپنی آزادی رائے کے ساتھ قبول کریں نہ کہ جبر و زور کی وجہ سے حکومت کو ہرگز یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ ان چیزوں کے اندر قانون اور طاقت کے ذریعہ سے کوئی تبدیلی پیدا کرنے کی کوشش کرے۔ اگر وہ ایسا کرے گی تو اپنے جائز حدود سے تجاوز کرنے کی مجرم ہو گی اور افراد کی شہری آزادی پر حملہ کرے گی جس کی حفاظت کے لئے خدا اور رسول کے نام پر اس نے ذمہ لیا ہے۔

اس میں شبہ نہیں ہے کہ خلافت راشدہ کے بعد مسلمان حکومتوں نے افراد کی اس بنیادی آزادی کو بسا اوقات سلب کرنے کی کوشش کی ہے۔ اسکے سبب سے بے شمار مسلمانوں کے جان و مال مظالم کے شکار ہوئے ہیں۔ بہت سے ائمہ کرام کو بھی نشانہ ستم بنایا گیا ہے اور حکومتوں کے مراکز اور بادشاہوں کے دربار مختلف گروہوں کی سازشوں کے اڈے بنے رہے ہیں لیکن یہ ساری باتیں اس بات کے سبب سے نہیں تھیں کہ اسلام نے حکومت کو لوگوں کے اعمال و عقائد کی جزئیات میں دخل دینے کا حق دیا ہے۔ بلکہ یہ مستبد حکمرانوں کی اپنی زیادتیاں تھیں کہ انھوں نے فقہ و کلام میں جو مسلک خود اختیار کیا اس مسلک کو تمام خلق پر بالجبر مسلط کر دینا چاہا۔ ایک صحیح اسلامی حکومت جو خلافت راشدہ کے نمونہ پر قائم ہو اس کے لئے اس امر کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ وہ کلام و فقہ کے مختلف مسالک لوگوں کے ذہنوں پر بالجبر ٹھونسنے کی حقدار نہیں ہے۔

۲۔ دوسری اہم حقیقت یہ ہے کہ ایک صحیح اسلامی ریاست کسی متعین امام کی تقلید اور کسی متعین فقہ کی پیروی کے اصول پر قائم نہیں ہو سکتی بلکہ یہ لازم ہے کہ اسکی بنیاد براہ راست

کتاب وسنت اور اجتہاد وشوریٰ پر ہو۔ دوسرے الفاظ میں اسکے معنی یہ ہیں کہ پوری فقہ اسلامی بلا کسی استثنا وامتیاز کے اس کا سرمایہ ہو اور وہ تمام اجتہادی امور میں، کسی تخصیص وترجیح کے بغیر، مختلف آئمہ کے اجتہادات پر نگاہ ڈال کر اپنے قانون کے لیئے ان اقوال اور رایوں کو انتخاب کرے جو اسکی نظر میں کتاب وسنت اور روح اسلام سے قریب تر نظر آئیں۔ جن امور سے متعلق اسکو پچھلے ائمہ کے اجتہادات میں کوئی بات نہ ملے کتاب وسنت کے تقاضوں کو پیش نظر رکھ کر وہ خود ان کا حل معلوم کرنے کی کوشش کرے۔ پچھلے آئمہ کے جو اقوال انتخاب کیئے جائیں گے ان میں وقتاً فوقتاً تبدیلیاں بھی ہو سکیں گی۔ یہ عین ممکن ہے کہ آج سابق ائمہ میں سے کسی کے کسی قول کو قانون کی حیثیت دے دی جائے لیکن کل دلائل کی قوت واضح ہونے کے بعد اس کی جگہ کسی اور کے قول کو اختیار کر لیا جائے ہمارے مختلف فقہی گروہوں میں سے ہر گروہ کا مسلک ومذہب حکومت کی نگاہوں میں یکساں عزت واحترام کا مستحق ہوگا اور ہر گروہ کے لوگوں کو اس بات کا پورا پورا موقع حاصل رہیگا کہ وہ اپنے اپنے مسلک ومذہب کے دلائل اور اسکی خوبیاں برابر پیش کرتے رہیں تاکہ ہمارے ائمہ کے چھوڑے ہوئے ذخیرہ کے اندر جس قدر جواہر موجود ہیں وہ برابر نکھر نکھر کے سامنے آتے رہیں اور قانون کی تدوین کرنے والوں کو ان کے انتخاب میں آسانی ہو۔

اس طریقہ پر حکومت اپنے عمل کے لیئے جو قانون بنالے گی ملک کا نظام اسی قانون کے مطابق چلے گا۔ عدالتیں اسی قانون کے مطابق مقدمات کے فیصلے کرینگی اور ہر شہری کو ان فیصلوں کی بے چون وچرا تعمیل کرنی پڑے گی لیکن ایک شخصی رائے کی حیثیت سے ایک شخص کوئی ایسا

مسلک اختیار کرسکیگا جو حکومت کے اختیار کردہ مسلک سے الگ ہو اور وہ اپنے اس مسلک کی حمائت میں زبان اور قلم کی قوت بھی استعمال کر سکے گا۔ وہ حکومت کے احکام و قوانین کی اطاعت کرتے ہوئے اس بات کا حق رکھے گا کہ وہ جس مسلک کو زیادہ قوی اور زیادہ مدلل سمجھتا ہے ایک رائے کی حیثیت سے اسکو پیش کرے۔ خلافت راشدہ کے زمانہ میں ایسے کتنے مسائل پیش آتے تھے جن میں امیر اور شوریٰ کے فیصلوں سے بہت سے لوگوں کو اختلاف ہوتا تھا۔ اگرچہ اختلاف کرنے والے اطاعت بہر صورت امیر کے فیصلوں ہی کی کرتے تھے لیکن وہ رائے کے حد تک بدستور اپنے مسلک پر قائم رہتے اور علانیہ اپنی رائے کی پبلک میں تائید و حمائت کرتے۔ اسکی ایک عمدہ مثال منیٰ میں حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے نماز قصر نہ کرنے کا واقعہ ہے۔ بہت سے لوگوں نے حضرت عثمانؓ کے اس مسلک سے پوری شدت کے ساتھ اختلاف کیا لیکن جب نماز کا وقت آیا تو اختلاف کرنے والوں نے بحیثیت امیر کے نماز حضرت عثمانؓ ہی کی اقتدا میں انہی کے مسلک کے مطابق ادا کی اس مسئلہ میں لوگوں کو حضرت عثمان غنیؓ کے مسلک سے جو اختلاف تھا وہ ان کے زمانہ میں بھی باقی رہا اور آج بھی باقی ہے۔

یہ اسی پابندی نظام اور آزادی رائے کی برکت ہے کہ خلافت راشدہ کے دور میں ملک کا نظام بھی پورے استحکام کے ساتھ قائم رہا اور فکر و اجتہاد کے لئے وہ سارا مواد بھی اسی زمانہ میں فراہم ہو گیا جس سے بعد میں اسلامی فقہ کی مختلف عمارتیں تیار ہوئیں۔ ایک صحیح اسلامی حکومت کے مزاج کا اصلی تقاضا یہی ہوتا ہے کہ لوگ تقلید کی بندشوں سے آزاد ہو کر فکر و اجتہاد سے کام لیں لیکن کوئی گروہ اگر اس کی خواہش کے خلاف تقلید کی بندشوں ہی

میں جکڑا ہوا رہنا پسند کرتا ہے تو حکومت اسکی اس خواہش میں بھی خلل انداز ہونا پسند نہیں کرتی بشرطیکہ وہ گروہ خود حکومت سے یہ مطالبہ نہ کرے کہ وہ بھی اسی کی طرح فکر و اجتہاد سے استغفار کرکے اپنے پاؤں میں تقلید کی بیڑیاں ڈال لے۔ عامۃ الناس کا کوئی گروہ تقلید کی بندشوں میں بندھا ہوا رہ کر بھی زندگی کے مقررہ دن کسی نہ کسی طرح پورے کر سکتا ہے لیکن ایک حکومت، اور وہ بھی ایک اسلامی حکومت، تقلید کی جکڑبند کے اندر دو دن بھی اپنی ہستی اپنے اصولوں کے مطابق باقی نہیں رکھ سکتی۔

ماضی میں جو حکومتیں کسی متعین فقہ کی تقلید کے اصول پر قائم ہوئیں یا آج جو اس اصول پر قائم ہیں یہ صحیح اسلامی حکومت کا نمونہ نہیں ہیں۔ کسی متعین فقہ کو نہ تو کتاب و سنت کا بدل قرار دیا جاسکتا اور نہ فقہ کے مختلف ائمہ میں سے کسی امام کو رسول اللہ کا درجہ دیا جاسکتا اس لئے اس طرح کی حکومتوں کو اسلامی حکومت کہنا اسلامی نظریہ سلطنت سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔ اسلامی سلطنت کے لئے یہ بنیادی شرط ہے کہ اسکی اساس براہ راست کتاب و سنت اور اجتہاد و شوریٰ پر ہو یہ حکومتیں اسکے بالکل برعکس یا تو اس اصول پر قائم ہوئیں کہ جو فقہی مذہب حکمراں کا ہو، اس نے اسی مذہب کو سارے ملک پر لاد دینا چاہا یا ملک کے باشندوں کی اکثریت جس فقہی مسلک کی پابند تھی اس کو پورے ملک کا مذہب بنا دیا گیا۔ یہ دونوں باتیں اسلامی نظریہ سلطنت کے خلاف ہیں۔ اس مسئلہ پر ہم نے اپنی کتاب "اسلامی ریاست" میں مفصل بحث کی ہے۔ اس وجہ سے یہاں اسکی تفصیل کی ضرورت نہیں ہے۔

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوگئی کہ ایک اسلامی حکومت اول تو ان جزوی باتوں

سے کوئی تعرض نہیں کرتی جن کا تعلق انفرادی زندگی سے ہوتا ہے، وہ اپنا براہ راست تعلق
صرف انہی امور سے رکھتی ہے جو اجتماعی اور سیاسی زندگی سے تعلق رکھنے والے ہوتے
ہیں۔ ثانیاً وہ ان امور میں بھی معاملات کو کسی خاص زاویہ نگاہ سے دیکھنے کے بجائے براہ راست
کتاب و سنت کے ان اصولوں سے رہنمائی حاصل کرتی ہے جن پر تمام مسلمانوں کو اتفاق ہے۔ اس
طرح ایک اسلامی ریاست کا ہر شہری اس بات میں بالکل آزاد ہوتا ہے کہ وہ اپنی انفرادی زندگی
کے دائرہ میں جس فقہی و کلامی مسلک کو ترجیح دیتا ہے اسکو اختیار کرے بشرطیکہ اصل دین
کے اندر اس کے لئے گنجائش موجود ہو۔ رہے اجتماعی مسائل تو ان کے بارہ میں اظہار رائے
کی آزادی ہر شخص کو حاصل رہتی ہے البتہ جب حکومت کسی ایک پہلو کو اختیار کر لیتی ہے تو اطاعت ہر شخص
کو اسی کی کرنی پڑتی ہے اور اس طرح آزادی رائے کے باوجود کسی اختلاف یا کسی فتنہ کی گنجائش نہیں رہتی،

## اسلامی ریاست میں مسلمان فرقوں کی حیثیت

یہاں تک ہم نے جو کچھ بیان کیا ہے اس کا تعلق ان گروہوں سے تھا
جو اصول دین، عقاید اسلام، اور ماخذ شریعت کے بارہ میں بالکل متفق ہیں۔ ان کے
اندر صرف وہ معمولی اختلافات ہیں جو دلائل کے اختلاف یا کسی اصول اجتہاد کے اختلاف
سے پیدا ہو جایا کرتے ہیں۔ اب ہم ان مسلمان فرقوں کے سوال پر غور کریں گے جو مسلمانوں کے
اندر شامل سمجھے جاتے ہیں لیکن مسلمانوں کے سواد اعظم سے وہ بعض عقائد میں بھی اختلاف
رکھتے ہیں اور بعض شریعت کے ماخذ کے بارہ میں بھی عام مسلمانوں سے کچھ مختلف نقطہ نظر

رکھتے ہیں۔

ان فرقوں کے مسئلہ کا حل اسلام میں یہ ہے کہ اسلام نے اسلامی ریاست کی شہریت کے لئے جو شرطیں قرار دی ہیں ان پر ان کو جانچا جائے۔ جو ان شرطوں پر پورے اتریں یا جو ان کو قبول کرلیں ان کو اسلامی ریاست کا پورا شہری قرار دیا جائے اور ان کے لئے وہ تمام حقوق تسلیم کئے جائیں جو اسلام نے اسلامی ریاست کے شہریوں کو بخشے ہیں۔ رہے وہ فرقے جو ان شرائط پر پورے نہیں اترتے یا وہ ان شرطوں کو منظور کرنے پر آمادہ نہیں ہیں تو ان کو ایک اقلیت قرار دے کر ان کے حقوق ایک اقلیت کی حیثیت سے محفوظ کر دیئے جائیں۔ اسلامی ریاست میں شہریت کے شرائط اور اس کے حقوق پر مفصل بحث ہم نے اپنی کتاب "اسلامی ریاست" کے ایک باب میں کی ہے، یہاں اسکے دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ البتہ یہاں مسئلہ کی وضاحت کے لئے ہم مذکورہ کتاب سے وہ اصول پیش کئے دیتے ہیں جن پر اسلامی ریاست میں شہریت کے حقوق کا حاصل ہونا مبنی ہے۔ وہ اصول یہ ہیں :-

۱۔ آدمی اللہ کی توحید کا اقرار کرے۔

۲۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو آخری پیغمبر اور آخری سند تسلیم کرے۔

۳۔ اسلامی طریقہ پر نماز پڑھے۔ عام مسلمانوں سے اپنی نماز الگ نہ کرے۔

۴۔ اسلامی بیت المال کو زکوٰۃ ادا کرے۔

۵۔ اسلام کے مقرر کئے ہوئے قبلہ کو اپنا قبلہ قرار دے۔

۶۔ نکاح، طلاق اور حلال و حرام کے بارہ میں اسلامی شریعت کے ضابطوں کی

پابندی کرے۔

جو فرقے ان شرطوں کو پورا کر رہے ہوں یا پورا کرنے کا اقرار کریں وہ اسلامی ریاست کے شہری ہیں۔ ان کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ فھو المسلم لہ ما للمسلم و علیہ ما علی المسلم (بخاری)، وہ مسلم ہیں ان کو مسلمانوں کے حقوق حاصل ہوں گے اور ان پر مسلمانوں کی ہی ذمہ داریاں ہونگی۔ ان کے ساتھ اسلامی ریاست کا معاملہ ان کے ظاہری رویہ کے مطابق ہوگا۔ حکومت کو ان کے عقاید کے بارہ میں خواہ مخواہ کی کھوج کرید کا حق نہیں ہوگا، باطن کا محاسبہ ریاست کے دائرہ بحث سے خارج ہے اس وجہ سے جب تک کسی فرقہ کے بارہ میں اس بات کی قطعی شہادت موجود نہ ہو کہ اس نے مذکورہ شرائط میں سے کسی شرط سے انحراف کیا ہے محض اٹکل پچو اندازوں کی بنا پر اسکے حق شہریت پر دست درازی کرنا جائز نہیں ہے۔

کسی فرقہ کو اسلامی ریاست میں شہریت کے حقوق دینے اور مسلمانوں کے ساتھ اس کو شامل رکھنے میں جس حد تک اسکے ساتھ رعایت کی جاسکتی ہے اسکے لئے ہم خوارج کی مثال پیش کرتے ہیں جن کا تعلق خلافت راشدہ کے زمانہ سے ہے۔ اس مثال سے اندازہ ہوسکیگا کہ تاویل کی غلطی اور متکلمانہ طرز کے غلو سے جو گمراہیاں پیدا ہوتی ہیں ایک صحیح اسلامی ریاست ایک بہت بڑی حد تک ان کو انگیز کرتی ہے اور ان کی بنا پر کسی فرقہ کو مسلمانوں سے کاٹنا پسند نہیں کرتی۔

خوارج کا فتنہ حضرت علیؓ کے زمانہ میں ظہور میں آیا۔ مختصراً اس کا واقعہ یوں ہے کہ

آٹھ دس ہزار آدمیوں کی ایک جماعت، ان کے لشکر سے اس بنیاد پر کٹ کر علیحدہ ہو گئی کہ انہوں نے خلافت کے قضیہ میں ابو موسیٰ اشعری اور عمرو بن العاص کی پنچایت کو کیوں منظور کیا۔ ان کا نعرہ یہ تھا کہ "ان الحکم الا للہ" اللہ کے سوا کسی کو فیصلہ کرنے کا حق نہیں ہے۔ اور اس کی تاویل وہ یہ کرتے تھے کہ اللہ اور قرآن کا فیصلہ براہ راست نافذ ہونا چاہیئے اس کے لئے کسی واسطہ کو اختیار کرنا شرک و کفر ہے، پھر آگے بڑھ کر وہ اس سے یہ نتیجہ نکالتے تھے کہ چونکہ علیؓ اور معاویہ دونوں نے پنچایت کو منظور کر کے (نعوذ باللہ) شرک و کفر کا ارتکاب کیا ہے اس وجہ سے وہ دونوں اور ان کے تمام ساتھی کافر ہیں۔ پھر ایک قدم اور آگے بڑھ کر ایک مرتبہ اس پر انھوں نے یہ جمایا کہ گناہ کبیرہ کا مرتکب کافر ہوتا ہے اور اس کے لئے دائمی عذاب جہنم ہے اور چونکہ علیؓ اور معاویہ نے گناہ کبیرہ کا ارتکاب کیا ہے اس وجہ سے ان کے لئے بھی (العیاذ باللہ) دائمی عذاب جہنم ہے۔

تاویل کی غلطی اور پھر متکلمانہ طرز کے غلو نے بات کہاں سے کہاں پہنچا دی۔ ایک طرف تمام صحابہ و تابعین پر کفر اور دائمی عذاب جہنم کا فتویٰ جڑ دیا گیا اور دوسری طرف ان الحکم الا للہ کی آڑ لے کر کسی سیاسی ادارہ کی ضرورت ہی سے سرے سے انکار کر دیا گیا جس کے دوسرے الفاظ میں معنی یہ ہوئے کہ نہ صرف ابو موسیٰ اشعری اور عمرو بن العاص کی پنچایت ناجائز اور حرام ہے بلکہ خلافت کا پورا نظام بھی سراسر کفر و معصیت ہے۔ بیئے اس اعتبار سے کے لحاظ سے خوارج ٹھیک ٹھیک نراج (An archy) کے علمبردار تھے اور خوارج کے سلسلہ میں انھوں نے جو بدعت و ضلالت

ایجاد کی اس میں تو آج تک وہ منفرد ہی ہیں۔

لیکن خوارج کی اس ضلالت کے باوجود معلوم ہے کہ حضرت علیؓ نے ان کے ساتھ کیا معاملہ کیا؟ پہلے تو انھوں نے افہام و تفہیم کے ذریعہ سے ان کو راہ راست پر لانے کی کوشش کی اور اس کوشش سے ایک حد تک فائدہ بھی ہوا، ان کی ایک جماعت راہ راست پر آگئی۔ لیکن اسکے بعد بھی جب ایک جماعت بدستور اپنی ضلالت ہی پر جمی رہی اور وہ کسی طرح سدھرتی نظر نہیں آئی تو حضرت علیؓ نے ان کو پیغام بھیجا کہ جب تک تم اپنے اس عقیدہ کی آڑ لیکر بدامنی اور خونریزی برپا کرنے کی کوشش نہیں کرو گے اس وقت تک ہم تم سے تعرض نہیں کرینگے لیکن اگر تم نے انتشار اور بدامنی پیدا کرنے کی کوشش کی تو ہم تمہاری سرکوبی کرنے پر مجبور ہونگے۔ نیل الاوطار میں ہے:۔

فارسل الیہم کونوا حیث شئتم وبیننا وبینکم ان لا تسفکوا دما ولا تقطعوا سبیلا ولا تظلموا احدا فان فعلتم نبذت الیکم الحرب۔

حضرت علیؓ نے ان کو پیغام بھیجا کہ تم کو آزادی حاصل ہے کہ جہاں چاہو رہو البتہ ہمارے اور تمہارے درمیان یہ قرارداد ہے کہ ناجائز طور پر کسی کا خون نہیں بہاؤ گے، بدامنی نہیں پیدا کرو گے، اور کسی پر ظلم نہیں ڈھاؤ گے۔ اگر ان باتوں میں سے کوئی بات تم سے سرزد ہوئی تو پھر میں تمہارے خلاف جنگ کا حکم دے دوں گا۔

دوسری جگہ حضرت علیؓ کے یہ الفاظ منقول ہیں:۔

لا نبدءکم بقتال مالم تحدثوا فسادًا۔ اگر تم نے کوئی بدامنی برپا نہیں کی تو ہم تم سے لڑنے میں پہل نہیں کریں گے۔

حضرت علیؓ نے ان سے جو وعدہ فرمایا تھا اسکو آخر وقت تک نبھایا اور ان کی گمراہیوں اور ان کے مفسدانہ نظریات کے باوجود ان کی آزادی اور ان کے حقوق میں اس وقت تک کوئی مداخلت نہیں کی جب تک انھوں نے ملک کے نظم و نسق کو درہم برہم کرنے کی کوشش نہیں کی۔ البتہ جب ان کو یہ پتہ چلا کہ وہ جتھہ بندی کر کے حکومت کا تختہ الٹنے کی کوشش کر رہے ہیں تو مجبورًا ان کو ان کی سرکوبی کے لیے اقدام کرنا پڑا۔ نیل الاوطار ج ۷ ص ۱۴۳ میں ان کی جتھہ بندی اور فساد انگیزی کا بیان اس طرح ہوا ہے:۔

"اور یہ لوگ ہر طرف سے نکل نکل کر مدائن میں اکٹھے ہونے شروع ہوئے۔ حضرت علیؓ نے مراسلت کر کے ان کو ان کے عقیدہ سے باز آنے کی دعوت دی لیکن انھوں نے کہا کہ جب تک علی تحکیم پر راضی ہونے کے سبب سے اپنے کفر کا اقرار اور اس سے توبہ نہ کرینگے اس وقت تک ہم اپنے نقطۂ نظر پر جمے رہیں گے۔ حضرت علی نے پھر مراسلت کی لیکن وہ بھی لاحاصل رہی۔ پھر انھوں نے کھلم کھلا زیادتیاں شروع کر دیں چنانچہ جن مسلمانوں کا ادھر گذر ہو جاتا ان کو قتل کر دیتے۔ یہاں تک کہ حضرت علیؓ نے عبداللہ بن خباب کو کسی علاقہ کا حاکم بنا کے بھیجا ان لوگوں نے ان کو پالیا اور قتل کر ڈالا۔ ان کے ساتھ ان کی لونڈی تھی جو حاملہ تھی اس کا پیٹ چاک کر کے بچہ نکال لیا۔ حضرت علیؓ کو

ان واقعات کی اطلاع ہوئی تو انھوں نے مجبوراً ان پر فوج کشی کی۔"

خوارج کی اس ضلالت اور ان کے باغیانہ اور نراجی نظریات کے باوجود حضرت علیؓ کی حکومت نے ان کے ساتھ جو طرز عمل اختیار کیا اس نے ہمارے فقہا اور ائمہ کے سامنے یہ سوال پیدا کر دیا کہ اگر کوئی فرقہ ایسا ہو جو نظریہ و عقیدہ کے حد تک اس بات کا قائل ہو کہ حکومت کے خلاف بغاوت کرنا جائز ہے لیکن عملاً نہ تو اس نے کوئی جنگ شروع کی ہو اور نہ اس کے لئے کوئی تیاری ہی کر رہا ہو تو اسلامی حکومت اسکے قتل کرنے کی مجاز ہے یا نہیں؟

امام شوکانی رحمۃ اللہ علیہ چند احادیث نقل کرنے کے بعد مذکورہ بالا سوال کا مندرجہ ذیل جواب دیتے ہیں اور ملاحظہ فرمائیے کہ کس قدر عمدہ جواب دیتے ہیں اور نبی صلعم کے ایک ارشاد سے کتنا نفیس اور کتنا نازک استدلال کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں:-

وفی احادیث الباب دلیل علی مشروعیۃ الکف عن قتل من یعتقد الخروج علی الامام مالم ینصب لذالک حربا ویستعد لھا لقولہ صلعم "فاذا خرجوا فاقتلوھم"

(نیل الاوطار ج ۷ ص ۱۴۷)

اور اس باب میں جو حدیثیں نقل ہوئی ہیں ان کے اندر اس بات کی دلیل موجود ہے کہ شریعت ان لوگوں کو قتل کرنے کی اجازت نہیں دیتی جو امام کے خلاف بغاوت کا عقیدہ رکھتے ہیں جب تک وہ اپنے اس عقیدہ کو عملی شکل دینے کے لئے کوئی جنگ نہ برپا کریں یا اس کے لئے کوئی تیاری نہ شروع کر دیں کیونکہ نبی صلعم کا ارشاد

ہے کہ "فاذا خرجوا فاقتلوهم" جب بغاوت کریں تب ان کو قتل کرو۔

دوسری جگہ فرماتے ہیں :۔

| | |
|---|---|
| وان قوما لو اظهروا رای الخوارج لم یحل قتلهم بذالك وانما یحل اذا کثروا وامتنعوا بالسلاح واستعرضوا الناس ۔ | اگر کوئی قوم اس طرح کی رائے کا اظہار کرے جس طرح کی رائے خوارج رکھتے تھے تو اس کی بنا پر ان کا قتل جائز نہیں ہوگا۔ ان کا قتل صرف اس صورت میں جائز ہوگا۔ جب ان کی تعداد زیادہ ہو جائے، وہ منظم ہونے لگ جائیں اور لوگوں کے جان و مال سے تعرض کرنا شروع کردیں۔ |
| (نیل الاوطار ج ۷ ص ۱۳۶) | |

امام خطابی اس بات پر علما کا اجماع نقل کرتے ہیں کہ خوارج اپنی ضلالت کے باوجود اپنے شہری حقوق کے اعتبار سے مسلمانوں کے اندر شمار ہوں گے۔ اور وہ مسلمانوں میں سے ایک فرقہ ہیں۔

| | |
|---|---|
| وقال الخطابی اجمع علماء المسلمین علی ان الخوارج مع ضلالتهم فرقة من فرق المسلمین واجازوا مناکحتهم واکل ذبائحهم وانهم لا یکفرون ماداموا متمسکین | خطابی کا قول یہ ہے کہ اس بات پر مسلمانوں کے علماء کا اجماع ہے کہ خوارج اپنی ضلالت کے باوجود مسلمانوں کا ایک فرقہ شمار ہوں گے اور ان کے ساتھ شادی بیاہ کی اور ان کا ذبیحہ کھانے کی اجازت ہے اور یہ کہ جب تک |

باصل الاسلام — وہ اسلام کے اصولوں پر قائم ہیں اس وقت تک ان کی تکفیر نہیں کی جائے گی۔

(نیل الاوطار ج ۷ ص ۱۴۱)

ابن بطال فرماتے ہیں کہ :۔

ذھب جمھور العلماء الی ان الخوارج غیر خارجین من جملۃ المسلمین — جمہور علماء کی یہ رائے ہے کہ خوارج مسلمانوں کے زمرہ سے خارج نہیں ہیں۔

(نیل الاوطار ج ۷ ص ۱۴۱)

خوارج کی اس مثال کو سامنے رکھ کر موجودہ مسلمان فرقوں کے متعلق بآسانی یہ فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ ان میں سے کون کون سے فرقے ایسے ہیں جن کے لئے اسلامی نظام کے اندر گنجائش نکل سکتی ہے اور کون سے فرقے ایسے ہیں جو اس کے اندر صرف ایک اقلیت ہی کی حیثیت سے سما سکتے ہیں۔ ان کو مسلمانوں کے برابر حقوق شہریت نہیں دئے جا سکتے۔

---

سرورق جدید اردو ٹائپ پریس، لاہور میں چھپا